قلعہ گولکنڈہ، حیدرآباد، دکن سے ماہانہ ادبی مجلّہ.....

انوار تحقیق

جلد۔۲ شمارہ۔۲ فروری ۲۰۱۶ء

زرتعاون:۔فی شمارہ:۔۵۰ روپئے سالانہ:۔۵۰۰ روپئے

نگراں:۔**سید عادل احمد**، محکمہ آثار قدیمہ، اسٹیٹ میوزیم، حیدرآباد، تلنگانہ

ایڈیٹر:۔**سید الیاس احمد مدنی**

زرتعاون کا ذریعہ:
Mr. Mubarak Hussain
Accnt no.: 50045054076
IFSC CODE: ALLA-0210134
Allahabad Bank, AMU, Aligarh

پتہ:۔ 9/10/389، نیم باولی مسجد، کٹھورا ہاؤس، گولکنڈہ قلعہ، حیدرآباد، تلنگانہ۔500 008

موبایل نمبر:۔09966647580 ای میل:۔anwaretahqeeq@gmail.com

مجلس ادارت

ڈاکٹر شاہد نوخیز اعظمی۔شعبۂ فارسی، مانو حیدرآباد

ڈاکٹر محمد عقیل۔شعبہ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی

ڈاکٹر سکینہ امتیاز خان۔صدر شعبہ فارسی، بمبئی یونیورسٹی، ممبئی

ڈاکٹر محمد قمر عالم۔شعبۂ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ

محمد توصیف خان کاکر۔شعبۂ فارسی، اے ایم یو۔علی گڑھ

احمد نوید یاسر ازلان حیدر

مدیر سہ ماہی ادبی جریدہ ''دبیر''۔کاکوری، لکھنؤ

ارمان احمد

مدیر سہ ماہی ادبی جریدہ ''عرفان''۔چھپرا، بہار

عاطفہ جمال

مدیر سالنامہ ''کوکب ناہید'' سندیلہ، ہردوئی

شیخ عبدالرحیم۔جماعت اسلامی ہند۔حیدرآباد، دکن

متبی علی خان۔نامہ نگار روزنامہ منصف، حیدرآباد، دکن

مجلس مشاورت

پروفیسر مسعود انور علوی۔شعبہ عربی اے ایم یو، علی گڑھ

پروفیسر عمر کمال الدین۔شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

پروفیسر سید حسن عباس۔شعبۂ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی

پروفیسر عزیز بانو۔شعبہ فارسی، مانو حیدرآباد

پی انورادھا ریڈی۔انٹیک، تلنگانہ اسٹیٹ، حیدرآباد۔چاپٹر

ڈاکٹر زرینہ پروین۔ڈائرکٹر آف آرکائیوز، حیدرآباد، دکن

ڈاکٹر سید محمد اصغر عابدی، شعبہ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ

احمد علی، کیپر مینسکر پٹ۔سلار جنگ میوزیم، حیدرآباد

ڈاکٹر سیدہ عصمت جہان۔شعبۂ فارسی، مانو حیدرآباد

ڈاکٹر ایم اے نعیم، حیدرآباد، دکن

جناب ایم اے غفار، استاد خطاطی، ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد

کشور جھن جھن والا، ماہر مسکوکات، ممبئی

امر بیر سنگھ۔ماہر مسکوکات۔حیدرآباد

فہرست مندرجات

	عنوان	مقالہ نگار	صفحہ
۱۔	اداریہ	مدیر	3
۲۔	احمد شوقی کی نعتیہ شاعری	ارمان احمد	۴
۳۔	سجان رائے بھنڈاری: بحیثیت فارسی تاریخ نگار	ڈاکٹر محمد ارشاد عالم	۱۲
۴۔	دیارِ شبلی کا ایک بے مثل شاعر: اقبال سہیلؔ	محمد توصیف خان کاکر	۱۵
۵۔	کنور رتن سنگھ زخمیؔ احوال و آثار	ڈاکٹر سید احمد میاں زیدی	۱۸
۶۔	امیر خسروؔ کی ایک اہم مثنوی: نہ سپہر	ڈاکٹر سید محمد میاں زیدی	۲۴
۷۔	حضرت شاہ تراب علی قلندر اور ان کی صوفیانہ شاعری	ناظرہ اسحاق	۳۰
۸۔	عزیز احمد بحیثیت ناقد	مبشرہ صدف	۳۸
۹۔	ڈاکٹر وای ایس آر، اے پی اسٹیٹ میوزیم کا شعبۂ پارچہ جات	سید عادل احمد	۴۱

اداریہ

حیدرآباد دکن ہندوستان کی جنوبی ریاستوں آندھراپردیش اور تلنگانہ کا مشترکہ دارالخلافہ ہے ۔ نظام کے دورحکومت میں دارالسلطنت رہا ہے۔حیدرآباد دکن اپنے سنہری تاریخ اور ثقافت کی وجہ سے مشہور ہے۔حیدرآباد دکن کوموتیوں اور مسلمان نظام بادشاہوں کا شہر کہا جاتا ہے ۔ یہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے ۔ اردواور تیلگو یہاں کی بولی جانے والی بڑی زبانیں ہیں ۔موجودہ دور میں انفارمیشن ٹیکنالوجی، آئی ٹی اور بایوٹیکنالوجی کا مرکز مانا جاتا ہے۔حیدرآباد کے انفوٹیک پارک کو'' سائبرآباد'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔

ریاستِ حیدرآباد دکن جس کا جغرافیاءنقشہ ہر دور میں بدلتا رہا17 ستمبر1948ءتک جب ہندوستانی فوجوں نے نظام کی حکومت کا خاتمہ کیا اس وقت تک بھی ایک عظیم رقبہ پر پھیلا ہوا86 ہزار مربع میل پر پھیلا ہوا انگلستان اور اسکاٹ لینڈ کے مجموعی رقبے سے بھی زیادہ تھا۔ 1923ء میں خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد اگرچیکہ اسلامی مملکتیں جو باقی تھیں سعودی عرب، افغانستان و ایران وغیرہ پر مشتمل تھیں لیکن خوشحالی وشان وشوکت کے لحاظ سے ریاست حیدرآباد کو جو بین الاقامی مقام تھا اس کا ذکر آج بھی انگریز مصنفین کی تصانیف میں موجود ہے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی سوانح حیات میں تذکرہ کیا ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب انگلستان معاشی طور پر دیوالیہ ہو چکا تھا ایسے وقت میں نواب میر عثمان علی خان کے گراں قدر عطیات نے بڑی حد تک سہارا دیا۔ مکہ معظمہا ور مدینہ منورہ کے پانی اور بجلی کے خرچ بھی ریاستِ حیدرآباد نے اپنے ذمے لے رکھے تھے اور اس عظیم مقصد کے لئے "مدینہ بلڈنگ" کے نام سے شان دار عمارتیں جو کہ آج بھی باقی ہیں مکہ اور مدینہ کے لئے وقف تھیں جن کے کرائے مکہ اور مدینہ کو بھیجے جاتے تھے اس کے علاوہ حاجیوں کو رہنے کے لئے رباط کے نام سے نظام نے مکہ اور مدینہ میں حرمین سے قریب عمارتیں بنوادی تھیں۔ ریاستِ حیدرآباد جس کی تاریخ 13ویں صدی کے آخر میں علاءالدین خلجی کی آمد سے شروع ہوکر بہمنی' شاہی اور آصفجاہی دور تک بیسویں صدی کے نصف تک پھیلی ہوئی ہے۔موجودہ حیدرآباد تقریباً دو ہزار مربع میل پر مشتمل ایک شہر ہے جسکے باقی حصے ریاست آندھراپردیش، کرناٹک اور مہاراشٹرا میں تقسیم ہو چکے ہیں۔ ریاست حیدرآباد کی خصوصیت تھی کہ یہ ہمیشہ امن وآشتی کا علمبردار، ہندو مسلم یکجہتی کی مثال اور علم وادب نوازی کی ایک ایسی مثال تھا جس کو دنیا تمام کے علم ودانشور، مفکرین ومورخین نے آکر اپنی خدمات سے مزید چار چاند لگائے۔

شہر حیدرآباد میں دیکھنے لائق کئی تعمیرات ہیں، جن میں مشہور چار مینار سب سے اہم ہے ۔ چند اور، مکہ مسجد، سالار جنگ میوزیم، گولکنڈہ، چومحلّہ پیلس، گگن محل، قطب شاہی مقبرے، جامعہ عثمانیہ، ہائی کورٹ، عثمانیہ دوا خانہ، برلا مندر، فلک نما پیلس، نظام دوا خانہ(NIMS)، حسین ساگر، نہروز والوجیکل پارک، راموجی فلم سٹی بھی اپنی شہرت کا لوہا منوارہی ہیں۔

مدیر

احمد شوقی کی نعتیہ شاعری

ارمان احمد، مدیر سہ ماہی ادبی جریدہ ''عرفان''، عرفان ایجوکیشنل سوسائٹی، چھپرا، بہار

جدید عربی شاعری میں احمد شوقی کا نام سنگ اساسی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے بارے میں الاستاذ احمد حسن الزیات **تاریخ الادب العربی** میں رقم طراز ہیں۔

"یکاد النقاد یجمعون علی ان شوقی کان تعویضا عادلا عن عشرة قرون خلت من تاریخ العرب بعد المتنبی لم یظهر فیها شاعر موهوب یصل ما انقطع من وحی الشعر ویجددمااندرس من نهج الادب"

احمد شوقی کی ولادت ۱۸۶۹ء میں قاہرہ کے ایک مالدار خاندان میں ہوئی۔ آپ کے والد ترکی یونانی اور چرکسی اور والدہ ترکی و یونانی نسل سے تعلق رکھتی تھیں۔ ابتدائی اور ثانوی درجات کی تعلیم شوقی نے قاہرہ کے مختلف مدارس میں حاصل کی۔ ۱۸۸۵ء میں جب شوقی نے ثانوی درجات کی تعلیم مکمل کی تو ان کے والد نے انہیں لاء کالج میں قانون کی تعلیم کے حصول کے لیے داخل کرادیا اور جب اس میں ترجمہ کا شعبہ قایم ہوا تو شوقی اس میں منتقل ہو گیے۔ اسی کالج میں عربی کے استاذ محمد بیسونی سے وہ متعارف ہوے، جن کی صحبت میں شوقی کی شعری حس بیدار ہوئی۔ محمد بیسونی کو شاعری پر قدرت حاصل تھی مگر وہ صرف موقع بموقع اور کسی نہ کسی مناسبتوں سے توفیق پاشا کے لیے مدحیہ قصائد لکھتے تھے۔ لہذا اپنے استاذ کی صحبت و ترغیب پر احمد شوقی مدحیہ شاعری کی طرف مائل ہوے۔ ۱۸۸۷ء میں شوقی ترجمہ کے شعبہ سے فراغت کے بعد توفیق پاشا کے دربار میں ملازم ہو گئے، پھر توفیق پاشا نے انہیں قانون کی اعلی تعلیم حاصل کرنے کے لیے فرانس بھیج دیا۔ جہاں شوقی نے چار سال گزارے اور مغربی تہذیب و تمدن کا قریب سے مشاہدہ کیا۔ وہاں کی علمی و ادبی سرگرمیوں کو دیکھا اور فرانسیسی ادبیات کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔

احمد شوقی ۱۸۹۲ء میں جب مصر واپس آئے تو توفیق پاشا کا انتقال ہو چکا تھا اور ان کی جگہ عباس ثانی بادشاہ ہو چکا تھا۔ عباس نے انہیں سرکاری محل میں شعبہ انگریزی کا سربراہ مقرر کر دیا۔ اس عہدے پر انہوں نے بیس سال کام کیا۔ اس زمانہ میں انہوں نے عباس کی مدح میں بے شمار قصائد لکھے جس کی وجہ کر وہ شاعر عباس بن گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ شوقی کو اس زمانہ میں آزادی میسر نہ تھی وہ قصر اور صاحب قصر کے تقاضوں کا پابند تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنی ذات اور فن کے لیے فارغ ہونے کی کوشش کی اور فرانسیسی شاعر ''لافونٹین'' La fontain کے طرز پر حیوانوں کی زبان میں شعر کہے۔ وکٹر ہیوگو کی شاعری کا مطالعہ کیا اور اسی طرز پر ''کبار الحوادث فی وادی النیل'' کے عنوان سے ایک طویل قصیدہ لکھا، جسے مستشرقین کی کانفرنس میں پڑھ کر سنایا۔ اسی اسلوب میں ایک عرصہ تک شاعری کرتے ہوے شوقی نے ''الوالهول، توت عنخ آمون، قصر الوجود'' جیسے قصیدے تخلیق کیے۔ جو فرعونیات کے نام سے مشہور و معروف ہیں۔ شوقی نے اپنی شاعری میں بعض جگہ عرب قومیت کو بھی موضوع بنایا ہے۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ قصر کی پابندیوں سے نکل کر زیادہ وسیع فضا میں پرواز کرنا چاہتے ہیں۔

شوقی کی شاعری کے دو دور ہیں پہلے دور میں وہ اشعار آتے ہیں جنہیں اس نے جلاوطنی سے پہلے کہے تھے۔ دوسرے دور میں وہ اشعار آتے ہیں جو جلاوطنی کے بعد کہے گئے ہیں۔ جلاوطنی کے بعد جب شوقی مصر آیا تو اسے پہلی قومی انقلابی تحریک میں شہید ہونے والے نوجوانوں سے مصر کی سرزمین لالہ زار نظر آئی اور اس نے شوقی کی شاعری کو نئے کینواس عطا کیے۔ اس نے اب نہ صرف اپنے ہم وطنوں کی خواہشات اور سیاسی جذبات کی ترجمانی میں گیت گائے بلکہ عربوں کی تمناؤں اور ان کے قومی جذبات کے بھی ترانہ لکھے۔ فرانسیسیوں کے خلاف شامیون کے انقلاب کے بارے میں

بہت سے قابل فخر اور قابل قدر قصیدے لکھے۔شوقی کے اشعار عربیت یعنی عرب قومیت کی ترجمانی کرنے لگے۔عربوں کی انجمنوں اور مجلسوں میں شوقی کے اشعار گائے جانے لگے۔ شعر دیکھیں۔

نحن فی الشرق والفصحی بنورحم
ونحن فی الجرح والآلام اخوان
کلما ان بالعراق جریح
لمس الشرق جنبه فی عمانه

(ہم اپنی مشرقیت اور فصیح عربی زبان کے التزام میں ایک دوسرے کے رشتہ دار ہیں اور درد وآلام میں ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ عراق میں اگر کوئی زخمی کراہتا ہے تو اس کی بازگشت عمان کے پہلوؤں میں سنائی دیتی ہے)

شوقی نے اپنی شاعری کا دامن اسلامی موضوعات تک پھیلایا اور بہت سارے قصیدے اللہ کی حمد وثنا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں لکھے۔شوقی کے دینی اور زاہدانہ اشعار بہت مقبول ہوے۔

ربنا یا ذا التجلی و الجلال
یا خفی اللطف یا رب النوال
هب لنا الصالح من عمر ومال
ربنا والطف بنا فی کل حال
ربنا ثبت علی الحق القلوب
وامنع الاساواء عنا والخطوب
ربنا اللهم جنبنا الذنوب
واهدنا الحکمة فی کل الفعال
ربنا اللهم اصلح شاننا
واقم فی نفعنا حکامنا
ربنا وحفظ بنا اوطاننا
واجعل الملة فی اوج الکلام

(اے رب ذوالجلال اے لطیف وصاحب عطا۔ہمیں پاکیزہ زندگی اور مال عطا کر اور ہر حال میں ہم پر رحم فرما۔دلوں کو حق پر ثابت رکھ اور مصائب ومحن کو ہم سے دور رکھ۔ہمیں گناہوں سے بچا اور ہر کام میں ہمیں صحیح سمجھ عطا فرما۔ہمارے حالات کو سدھار دے اور حکام کو ہمارے لئے نفع بخش بنادے۔ہمارے ذریعے ہمارے وطن کی حفاظت کر،اور مذہب کو معراج کمال تک پہنچادے)

نعت میں احمد شوقی کے تین قصیدہ بہت مشہور ہیں۔الھمزۃ النبویۃ،ذکر المولد اور نہج البردہ۔قصیدہ البردہ کی مقبولیت اسلامی دنیا میں بے مثال ہے،آج تک لوگوں پر اس قصیدہ کی وجہ سے وجد کا عالم طاری ہے۔شوقی نے علامہ بوصیری کے قصیدہ بردہ کے وزن وقافیہ پر ایک نعتیہ قصیدہ دوسو پانچ اشعار پر مشتمل لکھا جو ''نھج البردہ'' کے نام سے ہے۔کسی شاعر کے وزن وقافیہ پر اسی مضمون کو دوسرا شاعر نظم کرے تو اصطلاح میں اسے ''معارضہ'' کہتے

ہیں،لیکن شوقی نے اپنے قصیدہ کا عنوان معارضہ نہیں نہج رکھا ہے۔یعنی قصیدہ بردہ کے طرز یا اس کی تقلید میں کہا گیا۔شوقی کا قصیدہ الفاظ وترکیب اور شعری محاسن کے لحاظ سے عربی زبان کا ایک شاہکار ہے۔ احمد ذکی لکھتے ہیں:''شیخ بوصیری کا تتبع قدیم وجدید ہر دور میں بے شمار لوگوں نے کیا،لیکن ان کے قصیدۂ بردہ کو جو مقبولیت حاصل ہوئی تھی وہ آج بھی باقی ہے''۔شوقی کے قصیدہ سے بھی بردہ کی اہمیت کم نہ ہوسکی۔لیکن خود اس قصیدہ کو بے مثال رواج و شہرت نصیب ہوئی،مصر میں حدیث نبوی کے استاذ الاساتذہ اور جامعہ ازہر کے شیخ سلیم البشری نے اسکی شرح لکھی۔

قصیدہ روایتی تشبیب سے شروع ہوتا ہے جس کے ابتدائی اشعار یہ ہیں۔

ریم علی القاع بین البان والعلم
احل سفك دمی فی الاشهر الحرم
رمی القضاء بعینی جوء ذر اسداً
یا ساکن القاع ، ادرك ساکن الاحم
لما رنا حدثتنی النفس قائلة
یا ویح جنبك،بالسهم المصیب رمی
جحدتها و کتمت السهم فی کبدی
جرح الاحبة عندی غیر ذی الم

(ایک آہو جو''بان'' کے درختوں اور ٹیلوں کے درمیان ایک وادی میں ہے اس نے میرے خون کے بہائے جانے کو حرمت والے مہینہ میں حلال کر دیا۔قضا (وقدر) نے ایک ہرنی کی آنکھوں سے ایک شیر کو مار گرایا،اے وادی کی رہنے والی (یعنی ہرنی) جھاڑی کے رہنے والے (شیر) پر رحم کر۔جب اس نے ٹکٹکی لگا کر دیکھا تو میرے دل نے کہا ہائے میرا دل،نشانے پر لگ جانے والے تیر سے مارا گیا۔میں نے اپنے دل کی بات کو جانتے بوجھتے جھٹلایا،اور پیوست شدہ تیر کو اپنے جگر میں چھپا رکھا،کیونکہ دوستوں کا تیر میرے نزدیک درد دینے والا نہیں ہوتا)

تشبیب کا مضمون محبوب کی بے وفائی حسینوں کی ناوک فگنی اور شاعر کی بیچارگی اور بے بسی سے گریز کرتا ہوا اس منزل پر پہنچتا ہے جہاں شاعر کو محسوس ہوتا ہے کہ یہ دنیا ایک وہم اور دھوکے کے سوا کچھ نہیں۔یہاں کی کسی شے کا کوئی اعتبار نہیں ہے،یہ تصور اسے اپنے نفس کے محاسبہ پر مائل کرتا ہے۔ اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ اس نے زادِ آخرت فراہم نہیں کیا۔تو شاعر کے ذہن میں یہ شعور زندہ ہوتا ہے۔

ان جل ذنبی عن الغفران، لی امل
فی اللهم یجعلنی فی خیر معتصم
القی رجائی اذاعذ المجیر علی
مفرج الکرب فی الدارین والغمم
اذا خفضت جناح الذل اساله
عز الشفاعة، لم اسال سوی امم
وان تقدم ذو تقوی لصالحة
قدمت بین یدیه عبرة الندم

لــــزمـــت بـــــاب اميــــر الانبيـــــاء، ومـــن
يــمسك بــمــفتـــاح بـــاب الـلـــــه يــغتــنـــم
فـــكــــل فـــضــــل واحســــــان ،وعــــــارفة
مــــا بيــــن مستــلـــم مــنــــــه ومــلتــــزم
عــلــقـــت مـــن مـــدحــــه حبلاً اعـــزبــــه
فـــى يـــوم لا عـــزبــــاالانســــاب والــلــجـــم
مـــحـــمـــد صـــفـــوـة البــــارى ورحـــمتــــه
و بـــغية الــلـــــه مـــن خـــلـــق و مـــن نســم

(اگر چہ میری مصیبتیں نا قابل بخشش ہیں ،لیکن مجھے اللہ کی ذات سے امید ہے کہ وہ مجھے اپنی پناہ میں لے لیگا۔اس دن جب کے پناہ کا ملنا دشوار ہوگا ،یعنی روز قیامت میں،امید کا سہارا اس ذات کو بناؤں گا ،جو مصائب اور دردناک صورت حال کو دور کرنے والا ہے۔ جب میں عاجزی ودرماندگی کے شانے جھکا کر اس سے شفاعت کی سرفرازی طلب کروں گا تو اس کے لئے کوئی بہت بڑی یا مشکل بات نہ ہوگی۔(جو وہ قبول نہ کہ کر سکے)۔مراد رسول اللہ سے ہے۔جب متقی اور پرہیزگار لوگ اپنے اعمال صالحہ پیش کریں گے میں اس کے حضور اشک ندامت پیش کروں گا۔ لپٹ گیا ہوں''امیرالانبیاء'' کے در سے اور جو بھی خدا کے باب رحمت کی کنجی حاصل کر لیتا ہے،دولت (مغفرت)اس کو مل جاتی ہے۔ ہر قسم کے فضل واحسان اور کرم (سے سرفراز ہیں)جو اس در سے لپٹے ہوئے ہیں یا اسے چوم رہے ہیں۔میں نے ان کی مدح کر کے ایک رسی پکڑ لی ہے، جو میرے لئے اس دن باعث فخر ہوگی جس دن رشتوں اور حسب ونسب پر فخر نہیں کیا جا سکے گا۔وہ ''محمدؐ'' ﷺ ہیں (جن کی مدح میرا سہارا ہے)حق تعالی کی منتخب ترین خلقت ،اوراس کی رحمت (کا مظہر) ہیں اور سارے انسانوں اور جمیع مخلوقات میں اللہ تعالی کے پسندیدہ اور محبوب بندہ ہیں ۔)

استاذ الاساتذہ شیخ الازہر شیخ سلیم البشری کو جنھوں نے اس قصیدہ کی شرح لکھی یہ اشعار بہت پسند تھے۔جس میں شوقی نے مستشرقین کے اس خیال کی تردید کی کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔

قــــالــو غـــروت و رســل الـلـــــه مــــا بــعثـوا
لـــقتـــل نـــفــــــس ولا جــــــائـــوا الســـفك دم
جهــــل و تــــضـــــليـــل احـــــلام وســــفســـطة
فتـــحـــت بـــــالسيف بـــعـــد الـــفتـــح بـــالـــقـلـم
والشـــران تـــلـــقــــه بـــــالـخيـــر ضــقـــت بـــه
ذرعــــاوان تـــلـــقـــــه نـــــاشـــر يـــنـــحســـم
ســـل الـــمسيـــحية الـــغـــــراء كـــم شـــــربـــــت
بــــالـــصـــــاب مـــن شهـــوات الـظـــالـم الـغـلـم
لـــولا حـــمـــــلـــة لهــــا هبـــوا الـــنـــصـــرتهــــا
بـــالسيف مــــا انتـــفـــعـــت بـــالـــرفـق والـــرحـــم

(لوگ کہتے ہیں کہ آپ نے غزوے کئے حالانکہ اللہ اور اس کے رسول قتل وخونریزی کے لئے مبعوث نہیں کئے جاتے۔ یہ جہالت، گمراہی اور فریب کی بات ہے، آپ نے تلوار سے پہلے قلم سے دلوں کو فتح کیا تھا۔ برائی کا بدلہ اگر بھلائی سے دیا جائے تو اس میں تکلیف ہوتی ہے اور اگر برائی سے دیا جائے تو برائی ختم ہو جاتی ہے۔ مسیحیت سے پوچھو کہ ظالموں کے ہاتھوں اس نے کتنی خون آشامی کی ہے۔ اگر اس کے حامیوں نے تلوار نہ اٹھائی ہوتی تو نرمی اور محبت سے اسے ہرگز کامیابی نہ ہوتی۔)

نہج البردہ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، دوسو سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں ولادت نبوی ﷺ سے پہلے دنیا کی حالت اور خاص کر عربوں کی حالت، انکی دینی اور معاشرتی زندگی کی طرف اشارے ہیں، پھر ولادت باسعادت کا ذکر جمیل ہے۔ یتیمی کا بیان، ورقہ بن نوفل کی پیشن گوئی، سفر شام، رفاقت خدیجہ رضی اللہ عنہ، جنگ بدر واحد اور معجزات کا ذکر ہے، اور قصیدہ کے آخری حصہ میں آل واصحاب پر صلاۃ وسلام ہے۔

الھمزیۃ النبویۃ: یہ قصیدہ ۱۳۱ اشعار پر مشتمل ہے۔ جس میں آپ کے غزوات، معجزات اور معراج کی طرف اشارہ ہیں۔ آپ ﷺ کے فصاحت وبلاغت اور جود وسخا کی تعریف ہے، شہسواری اور شب بیداری، عبادت اور حسن سیاست کا ذکر ہے۔ اس قصیدے میں ۳۳ اشعار ایسے ہیں جن میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزوں کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ یہ سب آپ ﷺ ہی کا پرتو تھے۔ اور اس کے بعد آپ ﷺ کے اخلاق حمیدہ اور جمال ظاہری کا ذکر ہے۔ مطلع

ولد الهدى فالكائنات ضياء
وفم الزمان تبسم وثناء
الروح ، والملا الملائك حوله
لدين والدنيا به بشراء
والعرش يزهو والحظيرة تزدهى
والمنتهى ،والسدرة العصماء
وحديقة الفرقان ضاحكة البرا
بالترجمان شذية ، غناء
والوحى يقطر سلسلا من سلسل
واللوح والقلم البديع رواء
نظمت اسامى الرسل فى صحيفة
فى اللوح واسم "محمد" طغراء
اسم الجلالة فى بديع الحروف
الف هناك واسم "طه" بهاء

(سرچشمہ ہدایت پیدا ہو گئے، کائنات میں روشنی پھیل گئی، زمانہ کے لبوں پر تبسم اور حمد باری ہے۔ روح القدس، فرشتے، ملا اعلیٰ، ان کے اردگرد، دین ودنیا (کی سرفرازی) کی نویدیں دینے والے ہیں۔ عرش بریں دمک رہا ہے، حظیرۃ القدس، سدرۃ المنتہیٰ (جو اپنی نشانی میں ممتاز ہے) سب جگمگا رہے ہیں۔ گلشن فرقان کی پکڈنڈیاں خنداں ہیں، شاداب وسرسبز ہیں (اپنے) ترجمان (کی آمد) پر۔ وحی کی رم جھم بارش ہو رہی ہے، انوکھی شان والے لوح وقلم کی رونق

دو بالا ہوگئی ہے۔پیغمبروں کے اسمائے گرامی خوبصورتی کے ساتھ لوح پر جڑ دیئے گئے ہیں جن سے ایک چوکھٹا تیار ہوگیا ہے،اور اس کے وسط میں اسم محمد طغریٰ ہے۔اللہ کا نام بےنظیر حروف تہجی میں اس لوح کا ''الف'' ہے تو رسول ﷺ کا نام طٰہٰ اسی تختی میں ''ب'' ہے۔مطلب یہ کہ اللہ کے بعد رسول اللہ ہی کا نام وہاں درج ہے۔

ان ابتدائی سات شعروں کے بعد قصیدہ کا دوسرا حصہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

یا خیر من جاء الوجود تحیة
من مرسلین الی الهدی بك جاء وا
فاذا سخوت بلغت بالجود المدی
وفعلت مالا تفعل الانواء
واذا عفوت فقادراً ومقدراً
لا یستهین بعفوك الجهلاء
اذا رحمت فانت امٌ وابٌ
هذان فی الدنیا هما الرحماء

(اے وہ ذات گرامی جو دنیا میں ظاہر ہونے والوں میں سب سے بہتر ہے،آپ پر پیغمبروں کا سلام ہو جو آپ کی ہدایت لے کر آئے تھے۔جب آپ نے سخاوت کی تو سخاوت کو عروج تک پہنچا دیا اور وہ کر کے دکھا دیا جو برسات نہیں کر سکتا (یعنی سخاوت میں آپ بارش سے زیادہ فیض رساں ہیں) عفو و درگزر سے جب آپ کا نام لیا تو (انتقام یا سزا دینے کی) پوری طاقت رکھتے ہوئے اور (دشمن کو) پورا موقع دینے کے بعد معاف کیا،ناواقف لوگ بھی آپ کے عفو و درگزر کی ناقدری نہیں کر سکتے۔جب آپ ﷺ نے رحم و شفقت کا سلوک کیا تو (ایسا معلوم ہوا کہ) آپ ماں ہیں اور باپ ہیں،دنیا میں ماں باپ ہی شفقت کرنے والے ہیں۔یعنی دنیا میں شفقت کا مظہر ماں باپ ہوتے ہیں۔)

مصر میں میلاد النبی کا جشن بہت دھوم دھام سے منایا جاتا ہے میلے لگتے ہیں،دکانیں سجتی ہیں،کھیل تماشے ہوتے ہیں،اور جھوٹے پیمانے پر ہر جگہ میلاد کی مجلسیں ہوتی ہیں۔جس میں ہر طبقہ کے لوگ شریک ہوتے ہیں۔شوقی نے یہ قصائد دراصل انہیں مواقع کے لئے کہے تھے۔''ذکر المولد'' یہ قصیدہ بھی اسی قبیل کا ہے۔اس میں اکہتر (۷۱) اشعار ہیں۔جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

سلوا قلبی غداة سلا و ثابا
لعل علی الجمال له عتابا
ویسال فی الحوادث ذو صواب
فهل ترك الجمال له صوابا

(میرے دل سے (اس کی حالت) پوچھو،جس صبح کو وہ اپنے ہوش و حواس میں آ گیا۔شاید حسن کے خلاف وہ شکوہ سنج ہو۔مصائب کے موقع پر تو ہوش مند آدمی سے بات دریافت کی جاتی ہے کہ کیا ہوا (کیا ہوا تھا؟) مگر کیا حسن نے اس کی صواب دید باقی رکھی ہے!)

اس قصیدہ میں پچاس اشعار ''تشبیب'' پر مشتمل ہیں۔یہ تشبیب قدیم عربی انداز کی نہیں ہے جس میں کسی محبوب اور اس کے پڑاؤ کا ذکر ہو،اونٹنی اور اس کے اوصاف بیان کئے جائیں بلکہ صرف اس لحاظ سے کہ بطور تمہید کے شاعر نے مسلم معاشرے کے عیوب شمار کئے ہیں۔خود غرضی،بخل،

زکوۃ کی ادئیگی سے فرار، عبادت میں تساہلی، محنت ومزدوری کے کاموں سے بے رغبتی، وغیرہ۔نعت کی ابتدا ذکر ولادت سے ہوئی ہے جو اس قصیدہ کا موضوع ہے۔ چند اشعار

تجلی مولد الهادی، وعمت
بشائره البوادی والقصابا
واستدت للبریة بنت وهب
یدًا بیضاء طوقت الرقابا
لقد وضعته وهاجاً منیراٍ
کما تلد السماوات الشهابا
فقام علی سماء البیت نوراً
یضیء جبال مکة والنقابا
وضاعت یثرب الفیحاء مسکاً
وفاح القاء ارجاء وطابا
ابالزهراء قد جاوزت قدری
بمدحك، بید ان لی انتسابا
فما عرف البلاغت ذوبیان
اذالم یتخذك له کتابا

(ہادی اکرم ﷺ کی میلاد (کا دن) آ گیا،اوراس کی خوشیاں شہر شہر قریہ قریہ ہر جگہ پھیل گئی۔ بنت وہب (آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ بنت وہب) نے سارے عالم پر عظیم احسان کیا،اور احسان کا قلادہ ہر ایک کی گردن میں ڈال دیا۔انہوں نے حضور ﷺ کو ایک روشنی بخشنے والا آفتاب کی صورت میں جنم دیا،جس طرح آسمانوں سے چمکتے ستارے پیدا ہوتے ہیں۔ بیت اللہ کی چھت پر ایک نور چمکا جس نے مکہ،اس کی پہاڑیوں اور پہاڑی راستوں کو روشن کر دیا۔معطر یثرب مشک سے دمک اٹھا، وادیوں کے گوشے گوشے عطر بیز ہو گئے اور ان کی رونق بڑھ گئی۔ پدر زہراء! میں نے آپ ﷺ کی مدح کر کے اپنی حیثیت سے تجاوز کیا ہے، ہاں مجھے ایک نسبت غلامی ضرور حاصل ہے۔اگر کوئی صاحب قلم آپ ﷺ کو اپنا موضوع نہ بنائے تو وہ بلاغت سے بے بہرہ ہے۔

احمد شوقی کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے سچے قومی جذبات کے دباؤ میں اس موضوع پر قلم اٹھایا۔شوقی نے اپنے نعتیہ قصیدے میں ان اعتراضات کا معقول و مدلل جواب دیا جو اسلام پر وارد کئے جاتے ہیں۔ان کے دل میں ایک تڑپ اور خلش تھی جس نے انھیں حضور ﷺ کی مدح و توصیف پر مجبور کر دیا۔ بالخصوص شوقی نے اپنے نعتیہ قصائد میں آپ ﷺ کی ان صفات کو نمایاں کیا جن کی دعوت اسلام کے پھیلنے میں مدد ملی اور دشمنوں نے آپ کے حسن واخلاق سے مجبور ہو کر آپ کی صداقت کا کلمہ پڑھا۔اس تذکرے سے شوقی کا مقصد یہ تھا کہ آج کا مسلمان بھی ان صفات عالیہ واخلاق حسنہ کو اگر اپنے اندر پیدا کر لیں تو اس سے اسلام کو زبردست تقویت حاصل ہو گی۔

مراجع ومصادر:۔

احمد، ڈاکٹر فوزان۔ جدید عربی شاعری۔ بنارس: ادارہ البحوث الاسلامی جامعہ سلفیہ۔ ۲۰۰۸ء۔ پرنٹ۔
الزیات، احمد حسن۔ التاریخ الادب العربی۔ لکھنو: مکتبہ الاحسان۔ ۲۰۱۴ء۔ پرنٹ۔
حیات، محمد اظہر۔ احمد شوقی ایک مطالعہ۔ ناگپور: حیات بکڈپو۔ ۱۹۹۱ء۔ پرنٹ۔
شوقی، احمد۔ الشوقیات۔ القاہرہ: مطبع الاستقامۃ۔ ۱۹۵۳ء۔ پرنٹ۔
ضیف، شوقی۔ الادب العربی المعاصر۔ القاہرہ: دار المعارف۔ ۱۹۶۱ء۔ پرنٹ۔
ندوی، ڈاکٹر عبداللہ عباس۔ عربی میں نعتیہ کلام۔ لکھنو: مکتبہ اسلام۔ ۲۰۰۵ء۔ پرنٹ۔

☆☆☆

سجان رائے بھنڈاری: بحیثیت فارسی تاریخ نگار

ڈاکٹرمحمدارشادعالم،مرکزتحقیقات فارسی،علیگڑھ مسلم یونیورسیٹی،علیگڑھ،یوپی

مختلف محققین اور مورخین کے حوالے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا نام سجان رائے بھنڈاری تھا قوم کے کایستھ اورآپ کا آبائی وطن بٹالہ تھا۔ آپ کی تاریخ ولادت ووفات کے متعلق اختلاف ہے وثوق اور معتبر دلایل و براہین اس سلسلے میں بہت کم دستیاب ہیں انکی اپنی ذاتی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے جیسا کہ انھوں نے اپنی کتاب 'خلاصۃ التواریخ' کے آخری حصہ میں اورنگزیب کی تاریخ وفات (۲۸ ذی قعدہ ۱۱۱۸ھ مطابق ۲مارچ ۱۷۰۷ء) بیان کیا ہے جواس جانب اشارہ کرتی ہے کہ سجان رائے کی وفات اورنگزیب کے وفات کے بعد ہوئی ہوگی۔مگرکہیں بھی بھنڈاری کی وفات سے جڑی کوئی پختہ ثبوت دستیاب نہیں ہے جس کی بنیاد پرسجان رائے بھنڈاری کی تاریخ وفات کا تعین کیا جا سکے۔مختلف مورخین ومحققین نے اپنی الگ الگ رائے قایم کی ہے۔بحرحال سجان رائے کی تاریخ پیدائیشو وفات دونوں مختلف فیہ ہیں۔سجان رائے نے اپنی ایک تاریخی کتاب 'خلاصۃ التواریخ' میں بعد میں کچھ اضافات بھی کیئے ہیں۔اسی بنا پر بعض محققین کا خیال ان کے 'خلاصۃ التواریخ' کے بیان کی روشنی میں ہی ہے کہ سجان رائے کی موت اورنگزیب کی وفات کے بعد ہوئی ہوگی۔سجان رائے کی تاریخ وفات اگر چہ غیر معلوم ہے مگر وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ۱۱۱۵ہجری ۱۷۰۳-۰۴ء تک وہ بقید حیات تھے کیوں کہ یہی 'خلاصۃ السیاق' کا سال تکمیل ہے۔۱

سجان رائے عہداورنگزیب میں ملک کے ناظموں،کارپردازوں کے یہاں منشی گری کے عہدے پر فائز تھے۔سجان رائے عہد شباب سے ہی اعلی سرکاری افسروں کے منشی رہے تھے۔سجان رائے ذات کے کھتری تھےاوران کا پیشہ متصدی یا منشیگری تھا،نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کابل،ٹھٹھہ اورپنجور کی سیر وسیاحت بھی کی تھی ا۔ڈاکٹرسید عبداللہ کا ماننا ہے کہ سجان رائے ۱۱۱۰ہجری تک شاہی ملازمت سے مستعفی ہو چکے تھے۔۲

مختلف فہرست نگاروں نے سجان رائے کو پٹیالہ کا باشندہ بتایا ہے۔اگرفہرست بانکی پور کو دیکھا جائے تواس میں سجان رائے کو پٹیالہ میں متولد بتایا گیا ہے۔مگر یہ اشتباہ ہے کیونکہ سجان رائے اپنی جائے پیدائش بٹالہ بتاتے ہیں (جواس زمانے میں لاہور کا ایک چھوٹا سا شہر تھا) سجان رائے 'خلاصۃ التواریخ' میں لکھتے ہیں۔

''چون زاد و بوم نگارندۂ این نسخه دلکشا بتاله است ، لهذا اندکی از احوال آن شهر به تسوید در آوردن ضروری دانست''۳

حالانکہ سجان رائے کے سال تولد کے بارے میں صحیح طور پر اطلاعات موجود نہیں ہیں مگر خود سجان رائے کے درج ذیل بیان سے ظاہر ہے کہ جب ان کی عمر سن تمیز کو پہنچی تو وہ سرکاری ملازمت میں بہ حیثیت منشی مقرر ہوئے اوراپنی تمام عمر منشی گری میں گزاردی بقول سجان رائے۔

''از عنفوان ظهور شور به ملازمت ناظمان امور مملکت و مال و اکر آگاهان دولت و اقبال پیشۂ خطوط نویسی که عبارت از منشی گری باشد بسر برده''۴

سجان رائے ایک عالم تھےاورمنشی گری کے میدان میں نادرروزگار شخصیت کے حامل بھی تھے۔وہ غیرمسلم ہونے کے باوجود فارسی زبان پر عبور رکھتے تھے۔ان کی تالیفات انشاءپردازی کا ایک یادگار نمونہ ہیں سجان رائے کو چندر بھان برہمن کے بعد ہندوؤں میں ایک مستثنیٰ لکھنے والا شمار کیا جا سکتا

ہےاوروہ اپنے معاصرین ہندو لکھنے والوں میں سب سے بزرگ تسلیم کئے جاتے ہیں۔ جہاں تک منشی سجان رائے کی علمی لیاقت کا سوال ہے تو اس کے بارے میں مشہور مستشرق 'ہرمن ایتھے' کی رائے استناد کا درجہ رکھتی ہے۔ان کے خیال کے مطابق منشی سجان رائے علوم سنسکرت اور فارسی میں عالم متبحر اور مخصوصاً منشی گری کے میدان میں نادرالعصر والدوران تھے۔انہوں نے ذیل میں درج تصنیفات بطور یادگار چھوڑی ہیں۔

(۱) خلاصۃ الانشا(۱۱۰۲ھ مطابق ۱۶۹۰ء)۵

(۲) خلاصۃ التواریخ(۱۱۰۷ھ مطابق ۱۶۹۵ء)

(۳) خلاصۃ المکاتیب(۱۱۱۰ھ مطابق ۱۶۹۸ء)

(۴) خلاصۃ السیاق(۱۱۱۵ھ مطابق ۱۷۰۳ء)۶

یہ تمام تصنیفات انہوں نے عہد اورنگ زیب میں سپرد قلم کی تھی۔

سجان رائے کو ایک مورّخ کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے۔انہوں نے 'خلاصۃ التواریخ' میں قدیم ہندو راجاؤں کے بارے میں بہت تفصیل سے ذکر کیا ہے، شاہجہاں کے دور حکومت کا ذکر بہت ہی مختصر انداز میں کیا ہے یہاں تک کے شاہجہاں کے فرزندوں میں ہوئی جان نشینی کی لڑائی کے وجوہات اور تاریخی واقعات پر بھی خاطر خواہ روشنی ڈالی ہے۔ان حقائق کی روشنی میں سجان رائے کو ہندوستان کے تاریخ نویسوں میں مثلاً ابوالفضل، عبدالحمید لاہوری، اور محمد صلاح وغیرہ کے صف میں تو شمار نہیں کیا جاسکتا لیکن ان کی تاریخی خدمت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کو، ان کے زمانے کے لکھنے والے دوسرے درجے کے مسلم مورخین کی صف میں یقیناً شمار کیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک مغل دور کے ہندو مورخین کی بات ہے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ چندر بھان برہمن کے بعد مستثنیٰ مورّخ تھے۔

بیوریج نے سجان رائے بٹالوی کو ہیروڈوٹس کہا ہے وہ لکھتے ہیں کہ؛۔

''نا مناسب نہیں ہوگا اگر ہم سجان رائے بٹالوی کو ہندوستانی ہیروڈوٹس کہیں کیونکہ دونوں ہی مورخین کے یہاں صحیح اور دلکش پیرائے میں لکھی تاریخ ملتی ہے۔نیز دونوں بزرگون کی کتابوں میں صحیح اور دلکش تاریخ نگاری کے عناصر موجود ہیں اور دونوں غیر جانب دار مورخ ہیں۔گارساں دتاسی اسی لئے اس کتاب کو فرشتہ پر ترجیح دیتا ہوں''۷

ایلیٹ نے سجان رائے بٹالوی کو چور لکھا ہے وہ لکھتے ہیں کہ؛۔

''خلاصۃ التواریخ ادبی چوری کا بدترین نمونہ ہے کیونکہ اس کے مطالب ایک دوسری تاریخی کتاب، 'مختصر التواریخ' سے، چرائے گئے ہیں''۸

''اگر ان دونوں بزرگوں کی رائے کو دیکھا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دونوں کے رائے میں افراط وتفریط پایا جاتا ہے اور ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے مناسب ومعقول دکھائی دیتی ہے وہ لکھتے ہیں؛۔

''سجان رائے نہ تو ہیروڈوٹس کے مقابل ہے جیسا کہ بیوریج کا خیال ہے اور نہ ہی وہ دزد محض (چور) ہے جیسا کہ ایلیٹ نے کہا ہے بلکہ سجان رائے کی ''خلاصۃ التواریخ'' کچھ خاص وجوہات وعلل کی بنیاد پر دیگر تواریخ سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے ''مختصر التواریخ'' کا اول و آخر تقریباً ناقص ہے۔اس لئے یہ کتاب ''خلاصۃ التواریخ'' سے نقل ہے''۸

سجان رائے کی فارسی خدمات

تاریخ میں ہر دور اپنی چند ممتاز خصوصیات کے باعث کچھ امتیازات بھی رکھتا ہے۔ اگر ہم مملوک عہد کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمیں ہندوستان میں فارسی زبان میں لکھی جانے والی پہلی تاریخ ''تاج المآثر'' نظر آتی ہے جسے صدرالدین محمد بن حسن نظامی نیشاپوری نے ہندوستان میں رہ کر سپردِ قلم کیا تھا اور اس کے بعد مختلف عمومی اور علاقائی تاریخیں منظرِ عام پر آنی شروع ہوئیں اور تاریخ نویسی کا سلسلہ عہد بہ عہد چلتا رہا۔ جنھوں نے بالواسطہ طریقہ سے عہد وسطیٰ کی مرکزی اور درباری تاریخوں سے لڑ کر اپنی استناد کی مہر ثابت کی ہے۔

مغلوں کے آخری دور میں منشی سجان رائے بٹالوی کا نام فارسی تاریخ نگاری کے پردے پر زرّیں قلم سے منقش دکھائی دیتا ہے جنھوں نے نہ صرف فنِ تاریخ نگاری میں گرانقدر اضافہ کیا بلکہ فارسی تاریخ نگاری کی روایت کو اپنے زورِ قلم سے ترقی کے بامِ عروج پر پہنچا دیا۔ آپ کی تحریر میں تلاش و جستجو محققانہ رنگ اور دقیق النظری کارفرما ہوتی ہے جس کی جیتی جاگتی مثال 'خلاصۃ التواریخ' ہے جسے فارسی تاریخ میں بڑی اہمیت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

یہ امر بھی مسلم ہے کہ عہد مغلیہ میں غیر مسلم حضرات میں خاص طور سے کایستھ اور کھتری حضرات نے فارسی کے حوالے سے جو گراں بہا خدمات اور نمایاں کارنامے انجام دیئے ہیں وہ آج بھی عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ سجان رائے بٹالوی فارسی تاریخ نگار کی حیثیت سے فارسی میں ایک اہم اور معتبر نام ہے۔ تاریخ نگاروں کی فہرست میں عزت و وقار کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور اس عہد کے اہم تاریخ نگاروں میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔۹

کسی کی شہرت و بقا کے لئے بسا اوقات کوئی ایک کارنامہ ہی کافی ثابت ہوتا ہے یوں تو سجان رائے بھنڈاری نے فارسی زبان و ادب میں گراں بہا خدمات انجام دیں لیکن ان کی شہرت کی وجہ اور سبب تاریخ کے موضوع پر آپ کی مشہور زمانہ کتاب ''خلاصۃ التواریخ'' تصور کی جاتی ہے۔ اس کتاب پر مختلف ناقدین کی نظر پڑی اور سب نے اپنے اپنے نظریۂ تنقید کا مظاہرہ کیا اور جتنی ہی اس کی تنقید ہوئی اتنی ہی یہ کتاب عوام الناس کی مجلس میں نکھر کر سامنے آئی اور شہرت و مقبولیت کے بامِ عروج پر پہنچ گئی جس آج بھی بڑی اہمیت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور آئندہ بھی محققین اس سے استفادہ کرتے رہیں گے۔

کتابیات وحواشی

۱۔ فارسی ادب بعہد اورنگزیب، ڈاکٹر نورالحسن انصاری، انڈو پرشین سوسائٹی، دہلی، جنوری ۱۹۶۹ دہلی

۲۔ ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، ڈاکٹر سید عبداللہ، مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور، پاکستان، نومبر ۱۹۶۷

۳: خلاصۃ التواریخ، سجان رائے بٹالوی

۴۔ خلاصۃ التواریخ، سجان رائے بٹالوی

۵۔ story -p453

۶۔ A Descriptive Catalgue Persian Manuscript,MAAPRI Publication,Tonk,pp104.

۷۔ فارسی ادب بعہد اورنگزیب

۸۔ ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، ڈاکٹر سید عبداللہ

۹۔ تاریخ ہندوستان، ایلٹ. جلد ۸، ص ۵، بانکی پور

۱۰۔ ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، ڈاکٹر سید عبداللہ

۱۱۔ فارسی ادب بعہد اورنگزیب، ڈاکٹر نورالحسن انصاری، انڈو پرشین سوسائٹی، دہلی، جنوری ۱۹۶۹ دہلی

دیار شبلیؔ کا ایک بے مثل شاعر۔ اقبال سہیلؔ

محمد توصیف خان کاکر، شعبہ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اس خطۂ اعظم گڑھ پر فیضان تجلی ہے یکسر
جو ذرہ یہاں سے اٹھتا ہے نیر اعظم ہوتا ہے(اقبال سہیلؔ)

یونان ہند اعظم گڑھ برسہابرس سے اپنی علمی، فکری، فنی، سماجی، سیاسی اور ادبی خدمات کی وجہ سے ہندوستان کے خطۂ مشاہیر میں ممتاز رہا ہے۔ اس خطہ نے گلستان علم وادب کو کئی رنگا رنگ گل عطا کئے ہیں، جن کی بوئے دلفریب سے آج بھی ادبستان مہک رہا ہے اور تا ابد مہکتا رہے گا۔ ان شخصیات عطر بیز میں علامہ شبلی نعمانی، علامہ حمید الدین فراہی، مولانہ ضیاء الدین اصلاحی، مولانہ ابواللیث ندوی، مولانہ امین اصلاحی، مولانا اسلم جیراج پوری، محمد صغیر خان صوفیؔ، پنڈت راہل سنسراکتین، انور آعظمی، کیفی آعظمی، قاضی اطہر مبارکپوری، وغیرہ بڑی شہرت اور اہمیت کے حامل ہیں اسی زمرے میں ایک نام اقبال سہیل کا بھی آتا ہے۔ بیسویں صدی کی ابتداء میں جن بلند پایہ شخصیتوں اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے درمیان والہانہ محبت کا رشتہ قائم ہوا، ان میں دوسرے بہت سے لوگوں کے علاوہ اقبال احمد خان سہیل خاص اہمیت کے حامل ہیں، ان کا شمار دبستان شبلی کے نامور فرزندوں میں ہوتا ہے اگر چہ اقبال سہیل کے پیشۂ وکالت نے ان کی دیگر خوبیوں مثلاً شعر ونثر کو اتنا معترف نہیں ہونے دیا لیکن ان کا یہی سرمایہ سرمایۂ حیات بن گیا اور آج اقبال سہیل ہندوستان میں ایک بڑے شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔

اقبال احمد خاں سہیلؔ کی پیدائش ۱۸۸۴ء کو ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں بڑھریا تحصیل نظام آباد میں ہوئی ان کے والد نے ان کا نام ابولا مظفر حامد رکھا لیکن ان کے دادا انہیں اقبال کہہ کر پکارتے تھے اور بعد میں ادبی دنیا میں اقبال سہیل کے نام سے مشہور ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے کسی مکتب میں ہوئی اس کے بعد انہوں نے علامہ حمید الدین فراہی سے تفسیر وحدیث کے علاوہ سبعۂ معلقہ اور دیوان متنبّی کا درس لیا اس کے بعد کوئینس کالج بنارس میں داخل ہوئے۔ وہاں سے ایف سے کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا رخ کیا جہاں سے انہوں نے بی اے، ایم اے اور ایل ایل بی کی تعلیم حاصل کی، اقبال سہیل کو علامہ شبلی نعمانی سے شرف تلمذ حاصل ہوا، اور انہیں جن لوگوں کا ساتھ ملا ان میں ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر رشید احمد صدیقی وغیرہ شامل ہیں، اقبال سہیل اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ زندگی بھر پیشۂ وکالت سے منسلک رہنے کے بعد نومبر ۱۹۵۴ء میں اچانک فالج کا دورا پڑا تقریباً ایک سال اس مہلک بیماری میں مبتلا رہنے کے بعد ۷ نومبر ۱۹۵۵ء کو اس دار فانی سے عالم جاودانی کو کوچ کر گئے۔

اقبال سہیل ایک قادر الکلام اور نکتہ سنج شاعر تھے، ان کی شاعری میں جو شعریت عذوبیت اور معنویت ہے اسے بڑے سخن شناس اور ناقدین فکر وفن نے نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ اسے اپنی گراں قدر داد وتحسین سے نوازا بھی ہے، اقبال سہیل کی شعر گوئی میں جہاں بہت سارے محاسن جمع ہیں ان میں فرمائشی شاعری، برمحل شعر وگوئی اور فی البدیہہ شعر کہنا بھی شامل ہے۔ ان کی شاعری کا خاص جوہر ان کا زور کلام ہے یہ ایک وجدانی چیز ہے اس میں الفاظ کی شان وشوکت، بندش کی چستی، تخیل کی بلندی، مضامین کا زور کچھ اور ہی رنگ دکھاتے ہیں، یہ تمام چیزیں سہیلؔ کے کلام میں وافر مقدار میں پائی جاتی ہیں:

یہ مشت خاک اگر کر لے پر و بال نظر پیدا
تو اوج لامکاں تک ہوں ہزاروں رہ گزر پیدا
اسیروں میں اگر ہو جائیں کچھ آشفتہ سر پیدا
ابھی دیوار زنداں میں ہوا جاتا ہے در پیدا

اقبال سہیل کے زور کلام کا اندازہ ان کے اس منفرد انداز سے بھی لگایا جاسکتا ہے:

برق جمال یار یہ جلوہ ہے یا حجاب
چشم ادا شناس کو حیراں بنا دیا

اقبال سہیل نے تقریباً ہر صنف شاعری میں طبع آزمائی کی ہے،مگر قصیدہ گوئی اور غزل سرائی میں انہیں خاص ملکہ حاصل تھا،شاعری میں تخیل کی بہت اہمیت ہے اس کے ساتھ اسلوب بیان اور طرز ادا کی بھی اہمیت سے انکار ممکن نہیں تخیل اور اسلوب بیان مل کر شاعری کو دوام بخشتے ہیں،شاعری میں اور خاص طور پر اقبال سہیل کی غزلوں میں اس کا دلکش امتزاج ملتا ہے ذیل کے اشعار میں زبان کی شستگی اور پاکیزگی کے ساتھ تغزل بھی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے:

حسن فطرت کی آبرو مجھ سے
آب و گل میں ہے رنگ و بو مجھ سے
جو تصور سے ماورا نہ ہوا
وہ تو بندہ ہوا خدا نہ ہوا
رتبہ داں تھا جبین عشق کا میں
حسن کے در پہ جبہ سا نہ ہوا

اردو شاعری کی ایک عام خوبی یہ بھی پائی جاتی ہے کہ یہاں شاعر اپنی شوخیوں کو شاعری میں در لاتا ہے،خصوصیت کے ساتھ اودھ کے شعراء میں یہ خوبی بدرجۂ اتم موجود ہے چونکہ اقبال سہیل کی شاعری پر اودھی رنگ چڑھا ہوا تھا سلئے ان کے اشعار بھی شوخی و شگفتگی سے پر نظر آتے ہیں جن میں الفاظ کو نہایت شائستگی اور بیان کو سنجیدگی سے ادا کیا جاتا ہے۔اقبال سہیل کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت دل گرفتگی و خستگی سوز و گداز از دل آویزی اور نشتریت ہے جو از دل خیزد بر دل ریزد کے موثر انداز سے دل میں اتر جاتی ہے:

پیغام رہائی دیا ہر چند قضا نے
دیکھ بھی نہ اس سمت اسیران وفا نے
خود حسن بے نیاز نہیں فیض عشق سے
خو میرے دل کی ہے نگہہ بیقرار میں

ذیل میں ہم اقبال سہیل کے چند اشعار پیش کرتے ہیں جس سے ان کے افکار پر روشنی ڈالی جاسکتی ہے

اقبال سہیلؔ:

بس اتنی کائنات ہے حیات مستعار کی
شباب ہے حباب کا بہار ہے شرار کی
یہ مختصر سی داستاں ہے جبر و اختیار کی
کرشمہ ناز کوئی ہو خطا گناہ گار کی
سہیلؔ تیری شاعری ہے یا فسون سامری
روانیاں ہیں نظم کی خرام جوئے یار کی

مختصراً یہ کہ اقبال سہیل ان شعراء کی فہرست میں شامل ہیں جنہوں اردو کے فروغ میں گراں بہا خدمات انجام دی ہیں۔

☆☆☆

کنور رتن سنگھ زخمیؔ احوال و آثار

ڈاکٹرسیداحمدمیاں،شعبۂ فارسی لکھنؤیونیورسٹی،لکھنؤ

اودھ کی علمی وادبی فضا لوگوں کے دلوں پر ایسے اثر انداز ہوئی کہ یہاں بلاتفریق مذہب وملت ہندو ومسلمان ایک دوسرے کے علوم وفنون سے دلچسپی لینے لگے خاص کر فارسی زبان کو سیکھنے میں ہندوؤں نے خاص دلچسپی دکھائی اور کئی صاحب دیوان شاعر، صاحب تصنیف نثر نگار، تذکرہ نگار اور داستان نگار پیدا ہوئے ان ہندو اہل علم وفن میں کنور رتن سنگھ متخلص بہ زخمیؔ کا نام سرفہرست ہے۔ زخمیؔ کا خاندان شروع سے نوابین اودھ کی خدمت کرتا آیا تھا۔ زخمیؔ کے جد راجہ بھگوان داس تو وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر (۱۱۸۹ء-۱۲۱۲ھ) کے اتالیق تھے اور انہیں بعد میں حسن خدمت کی وجہ سے بریلی کی نظامت بھی سپرد کی گئی تھی۔ زخمیؔ کے والد بالک رام متخلص بہ صبوریؔ کا شمار اچھے شعراء میں ہوتا تھا۔

صبوریؔ مہاراجہ جھاؤلال کے نائب تھے اور نواب آصف الدولہ بہادر نے انہیں میر آتش کے عہدے پر مامور کیا تھا۔ ان کی شہرت اور اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ لکھنؤ کا توپ خانہ ''بالک گنج'' (جواب استعمال کثرت سے بالہ گنج ہو گیا ہے) انہی کے نام سے آج بھی مشہور ہے۔ صبوریؔ ایک لمبی مدت تک نواب آصف الدولہ کے دیوان رہنے کے بعد ۱۲۱۱ھ میں عظیم آباد (پٹنہ) چلے گئے۔ ۲۸/ربیع الاول ۱۲۱۲ھ کو جب نواب موصوف کا انتقال ہوا تو صبوریؔ کافی دل برداشتہ ہو گئے اور حتیٰ کہ ملازمت ترک کر کے آوارگی اختیار کی اور اسی عالم میں ۱۲۶۰ھ میں انتقال کیا۔ تذکرہ نویسی در ہندو پاک کے مصنف لکھتے ہیں:

> ''پدر زخمی رای بالک رام متخلص بہ صبوریؔ نایب مہاراجہ جھاؤلال بودہ در سرکار نواب آصف الدولہ سمت میر آتش را داشت و توپخانہ ''بالک گنج'' در لکھنؤ ھنوزھم بنام وی مشہور است۔ وی مدتی صاحب دیوان نواب آصف الدولہ بود۔ بالاخرہ در غرہ شوال ۱۲۱۱ھ بہ عظیم آباد رفت و نواب مزبور کہ وی را خیلی دوست داشت ''تاب جدائی نیاوردہ'' روز ۲۸/ربیع الاول ۱۲۱۲ھ از این سرای فانی بعالم جاودانی شتافت و بالک رام نیز خدمت شاھی را ترک گفتہ از دنیا مافیہای خب و بی پروا شد و تا مدتی در بلاد مختلف ھند آوارہ و سرگردان ماند۔ البتہ گاھی برای دیدن پسر خود زخمی آمد و باز بعلت شوریدگی بسر گردانی می پرداخت تا بالاخرہ در ۱۲۶۰ھ از این سرگردانی راحت شدہ و سر بزیر خاک کشیدہ بخواب ابدی فرو رفت۔''(۱)

کنور رتن سنگھ زخمیؔ کے آباواجداد کا وطن بریلی تھا مگر ان کی ولادت ۲۲/محرم الحرام ۱۱۹۷ھ مطابق ۹/دسمبر ۱۷۸۲ء کو لکھنؤ میں ہوئی۔ فارسی تذکرہ نویسی نے اتنے مفصل طور پر زخمیؔ کے احوال کا ذکر کیا ہے کہ ان کی زندگی کے تمام پہلوا جاگر ہو گئے۔ زخمیؔ کو تحصیل علوم وفنون کا شوق بچپن سے ہی تھا اسلئے انہوں نے علوم عقلیہ ونقلیہ اور اس زمانہ میں مروجہ تمام زبانوں مثلاً عربی، فارسی، ترکی، انگریزی اور سنسکرت وغیرہ کی تعلیم حاصل کی۔

> ''زخمی در لکھنؤ در شب یک شنبہ ۲۳/محرم سنہ ۱۱۹۷ھ مطابق ۹/دسمبر ۱۷۸۲ء میلادی چشم بدنیا گشود و در آغاز شباب شوق اکتساب علوم بدلش افتاد بنا براین بعضی زبانہای مشہور و متداول مانند فارسی و عربی و انگلیسی را بقدر مایحتاج فرا گرفت و با علوم عقلیہ ونقلیہ در این زبانہا آشنا شد۔ (۲)

مگر اس تاریخ ولادت میں ایک اختلاف یہ بھی ہے کہ زخمی کے بیٹے کے داماد اور ''ریاض العارفین'' کے مصنف نے ان کی ولادت ۱۱۹۰ھ لکھی ہے۔ زخمی کو سرکار اودھ کی طرف سے مہاراجہ اور منشی الملوک کے خطاب ہوئے تھے۔ زخمی اپنی تصنیف ''شرح گل گشتی'' میں اپنے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''رتن سنگھ زخمی تخلص ابن بالک رام ابن راجہ بھگوان داس سہای بہادر۔'' (۳)

''ریاض الفصحاء'' کے مؤلف غلام مصحفی ہمدانی نے جن کی ملاقات زخمی سے ایک مشاعرے میں ہوئی تھی اپنے تذکرے میں زخمی کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

''کنور جی متخلص بہ زخمی خلف الصدق رائے بالک رام، جوانے وجیہ وقابل ودانا ومہذب الاخلاق است فقیر اورا روزے درمشاعرۂ مرزا حاجی صاحب دیدہ بود وضع مرزا یانہ دارد درخواندن شعر ہم تتبع مردم ولایت می کند عمرش قریب بہ چہل رسیدہ شاگرد مرزا قتیل مرحوم شدہ می گویند۔۔۔۔'' (۴)

احمد گلچین معانی کے زخمی کے متعلق یہ افکار ہیں:

''زخمی۔ مہاراجہ رتن سنگھ بہادر کہ از شاھان اودھ بخطاب فخر الدولہ دبیر الملک رتن سنگھ بہادر ھوشیار جنگ سرفراز بود، اصلش از بریلی رامپور ست، پدرش رای بالک رام درسرکار وزیر الممالک نواب آصف الدولہ بھادر والی ملک اودھ عہدۂ میر آتشی راانصرام می نمود، وتوپخانہ ''بالک گنج'' درلکھنؤ بنامش الی الآن مشہور، وزخمی درعہد غازی الدین حیدر اولین بادشاہ دارالسلطنت لکھنؤ ثمرۃ الخلافہ نصیر الدین حیدر بادشاہ دومی بخطاب وخدمت منشی الملوکی مخاطب ومامور بود، ودرزمانۂ محمد علی شاہ سومین شاھان لکھنؤ بمنصب دیوانی آن ریاست وخطاب مہاراجگی کلاہ گوشہ بآسمان شود، وپایان کار درسنۂ یک ہزار وصد وشصت وچہار دین اسلام راملت حقہ یافتہ اختیار نمود، و بعد سہ سال درسنہ ۱۲۶۷ھجری راہ آخرت پیمود، با اکثر علوم عربی وفارسی وترکی وانگریزی وسنسکریت آشنائی داشت، وپسرش کنور دولت سنگھ شکری تخلص کہ درعنفوان جوانی مرد۔۔۔۔'' (۵)

تذکرہ نویسی فارسی میں زخمی کے احوال پر خاصی تفصیل سے نظر ڈالی گئی جو اس طرح ہے:

''اسم مولف این تذکرہ کنور رتن سنگھ متخلص بہ زخمی است کہ از طرف شاھان اودھ بالقاب منشی الملکوک فخر الدولہ دبیر الملک مہاراجہ (رتن سنگھ) بہادر ھوشیار جنگ مفتخر شد۔ وی سکمینہ کایستھ بود واصلش از بریلی بود۔ خانوادہ او از چندین پشت درخدمت شاھان اودھ بودند وجدش راجہ بھگوان داس دیوان وا تالیق (استاد) وزیر الممالک نواب آصف الدولہ بہادر (۱۱۸۹ھ۔۱۲۱۲ھ) ولی اودھ بودہ وبعد اَمدتی ناظم بریلی بود۔'' (۶)

حصول علم کے بعد سیر وسیاحت کے شوق کو مدنظر رکھتے ہوئے بریلی، کلکتہ وغیرہ کے سفر کئے اس کے بعد ۱۲۳۰ھ لکھنؤ واپس آکر خدمت سرکار اودھ سے منسلک ہوئے۔

''مؤلف بسیر وسیاحت اکثر بلاد ھندوستان پرداختہ ونخستین مسافرت وی از لکھنؤ بہ بریلی وطن آبائی وی بود۔ سپس در ۱۲۱۸ھ بہ کلکتہ رفت وآنجا چند سال درخدمت ایسٹ انڈیا کمپنی بود۔ بالاخرہ در ۱۲۳۰ھ بہ لکھنو مراجعت

نمودہ درخدمت شاہ اودھ درآمد۔''(۷)

''وی دودمان زمان غازی الدین حیدر اولین پادشاہ اودھ و پسروی نصیر الدین حیدر دومین پادشاہ اودھ بلقب وخدمت منشی الملو کی ملقب و مامور شدودرزمان محمد علی شاہ سومین پادشاہ اودھ بسمت دیوانی آن ریاست و بہ لقب مہاراجگی مفتخر وبالاخرہ وزیرائی اودھ شد۔''(۸)

''زخمی گاہ گاہی بسیاحت نقاط مختلف ھندوستان می پرداخت ۔ درموقع تالیف این کتاب (۱۲۳۹ھ یا ۱۲۴۵ھ) اکثر اوقات خودرادر بریلی بسر میبر دوگاھی بلکھنؤ می رفت۔''(۹)

رتن سنگھ زخمی مسلمانوں کی تہذیب وتمدن، شرافت ونفاست سے کچھ اس قدر متاثر ہوئے کہ ۱۲۶۴ھ میں مشرف بہ اسلام ہوگئے اوران کا خاتمہ بھی اسلام پر مسلمان ہونے کے صرف تین سال بعد یعنی ۱۲۶۷ھ میں ہوا۔

''درسال ۱۲۶۳ھ زخمی مسلمان شد و بعد از سہ سال در (۱۸۵۰ء۔۱۸۵۱ء م) فوت کرد۔ اشپرنگر نیز سال وفات وی را ۱۸۵۰ء یا ۱۸۵۱ء میلادی ثبت کردہ است۔''(۱۰)

ان کی صرف ایک ہی اولاد تھی دولت سنگھ جو بڑے صاحب کمال شخصیت کے مالک تھے اور پر گو شاعر بھی تھے شکری تخلص کرتے تھے مگر عین جوانی میں راہیٔ ملک عدم ہوئے۔

زخمی کے آثار میں ۴ تصانیف کا پتہ چلتا ہے:

(۱) جام گیتی نما

(۲) سلطان التواریخ: (یہ شاہان اودھ کی مفصل تاریخ ہے)

(۳) دیوان فارسی

(۴) انیس العاشقین

زخمی نے فن شعر میں میرزا حسن قتیل کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا مقتدمین شعراء کی طرز پر طبع آزمائی کرتے تھے اور ایک ضخیم دیوان بھی مرتب کیا تھا جس کا ایک نسخہ خدا بخش لائبریری (پٹنہ) میں موجود ہے۔

''بعنایت۔۔میرزا حسن (متخلص بہ) قتیل۔۔۔(فن) شعر گفتن'' آموخت وبسبک شعرای متقدم شعر میسرود وبفارسی دیوانی دادہ بود۔''(۱۱)

دیوان کے چند اشعار یہاں ان کی شعر گوئی کا اندازہ لگانے کے لئے درج کئے جارہے ہیں:

چہا چہا کہ نہ دیدم من از جفائے فراق
مباد روزئ کس ہمچو من بلائے فراق
جگر نہند بہ خوں جاں بلب رسید اے وائے
من ستم زدۂ و ایں عذاب ہائے فراق
ازیں بلاست رہائی مرا کجا ممکن
فراق بہر منست و منم برائے فراق

منال ایں ہمہ زخمی ز درد ہجر منال
خدا دہد بنور و ز جزا جزاے فراق

☆ ☆ ☆

اضطراب تو بیتابی بسمل دارم
یارب ایں درد چہ درد است کہ در دل دارم
وائے زیں حسرت دیدار کہ در خوں شب و روز
دست و پا می زنم و خوں سوئے قاتل دارم
پیش ازاں دم کہ بمیرم بر من آرندش
سخنی چند بہ آں حور شمائل دارم
یار با غیر بروں رفتہ و من خانہ خراب
نیست معلوم چرا جائے بہ محفل دارم
جاں بلب دل ہمہ خوں سینہ پر از داغ جنوں
طرفہ حالیست کہ زخمی من بیدل دارم

☆ ☆ ☆

کے کے تو از صبا بہ کنار من آمدی
ما مردم از غم و بہ مزار من آمدی
می کشت رشک غیر مرا تا سحر ولے
قربانت اے اجل کہ بہ کار من آمدی
زخمی چہ بد بلاست کہ بر دست بحیلہ
چوں بے خبر بہ مشت غبار من آمدی

☆ ☆ ☆

سر ما راست کجا بامن دل تنگ او را
کہ پئے صلح رقیب است بمن جنگ او را
گر چہ مہ منیر برابرش زد و رفت ولے
ہمرہی کرد غبارم دو سہ فرسنگ او را
آنکہ ہر گز نہ زند گوش بر افسون کسے
کہ دارم آں ہمہ زخمی بچہ نیرنگ او را

☆ ☆ ☆

بخشد اگرم جان دم بسمل عجبی نیست
آییست دگر خنجر آن عہد شکن را
زخمی مگرت چشم سفیدست کہ داری
نسبت بکف پای کسی برگ سمن را

تذکرہ انیس العاشقین:

مؤلف (رتن سنگھ زخمی) نے اس تذکرے کو ۱۲۴۵ھ میں مکمل کیا اس بات کا پتہ دانشگاہ لاہور کے نسخہ سے چلتا ہے انہوں نے درج کیا ہے کہ یہ کتاب ۱۲۴۵ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی، مگر اس تذکرہ کے جلد دوم جس کا عکسی نسخہ کتابخانہ لالہ پرشاد میں یہ عبارت نظر آتی ہے:

''بست و ھفتم (بست و ھفتم) رمضان المبارک سنہ ۱۲۳۶ ھجری مطابق بست ھفتم مئی (مہ) سنہ ۱۸۲۴ عیسوی (میلادی) حسن تحریر پذیرفت۔۔۔کتبہ عبدالمذ نب غلام حسین۔'' (۱۲)

مؤلف نے اس تذکرہ کی وجہ تالیف کا ذکر بھی تصنیف کے دیباچہ میں کیا ہے جو اس طرح ہے:

''ازعنفوان شباب بنظم اشعار مایل وصحبت شعرا را سایل بودہ ام وھنگام فراغ از کتب معقول ومنقول بملاحظہ دواوین بلاغت تضمین قدماومتاخرین بسرمی نمودہ ام تادرسنہ ۱۲۴۵ء یکہزار ودوصد (دویست) وچہل وپنج ھجری کہ وارددارالسلطنہ لکھنؤ بودم شغف بعضی اشعار عاشقانہ شعرای بانام ونشانہ (معروف) رافراہم آوردہ با قلیلی از حالات ھریکی بنہایت ایجاز بقلم سپردم وبانتخاب غزل ورباعی اقتصار ورزیدہ ازتحریر اشعار قصیدہ ومثنوی الابضرورت درگذشتم۔'' (۱۳)

یہ تذکرہ تقریباً دو ہزار (۲۰۰۰) یا اس سے بھی زیادہ مقدمین ومتاخرین شعراء کے احوال اور انتخاب کلام پر مشتمل ہے اس کی ترتیب الف بائی ہے جو شاعر کے نام یا تخلص سے ہے۔اس کے مقدمہ میں نصیرالدین حیدر شاہ اودھ (۵۳۔۱۲۴۲ھ) کی مدح میں ۳۲ حرف لکھے گئے ہیں اور ہر حرف الف بائی ترتیب سے ہے۔اس تذکرے کی جلد اول آبرؔو سے شروع ہو کر ضیاؔئی پر مکمل ہوتی ہے اور دوسری جلد طالب جاجرمؔی سے شروع ہو کر یونس ابہرؔی پر مکمل ہوتی ہے۔

مؤلف نے تذکرہ میں شعراء کے متعلق زیادہ سے زیادہ اطلاعات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں تک اطلاعات فراہم ہوسکیں وہ اس تذکرہ میں درج کر دیں۔مثلاً شعراء کا نام، اس کا تخلص، اس کی کنیت، ولایت، مصنف، ذات، شغل، جائے پیدائش، وفات، لقب، پیشہ، تاریخ پیدائش اور جائے مدفون وغیرہ۔

مؤلف کو اگر کسی شاعر میں کوئی خصوصیت معلوم ہوئی یا وہ اس سے نجی طور پر واقف ہے وہ درج ہیں۔مثلاً عتاؔبی کے بارے میں لکھتا ہے:

''عتاؔبی از لطیفہ گویان بخوف اشرف بود۔'' (۱۴)

طالعیؔ کے بارہ میں مؤلف کی آراء ملاحظہ ہو:

''طالعیؔ ازشعراءوخوشنویسان یزد بود۔'' (۱۵)

مؤلف رتن سنگھ زخمی نے اپنے اس تذکرے کو نصیرالدین شاہ اودھ کے نام معنون کیا ہے۔

اس تذکرے میں شعراء کے احوال خاصے مختصر طور پر بیان کئے گئے ہیں۔مثلاً آبرؔو وآتوؔن وآثمؔ اکبرآبادی وغیرہ۔

مؤلف نے بعض شعراء کا حال مختصر تو بیان کیا ہے مگر جامع طور پر لکھا ہے مثلاً آزادؔ بلگرامی و آشناؔ و آصفؔ وغیرہ۔
بہت کم شعراء ایسے ہیں جن کے احوال کا ذکر مفصل طور پر آیا ہے مثلاً آرزوؔ وارزقیؔ وانسیؔ وغیرہ
مؤلف نے شعراء کے احوال کی طرح ان کا نمونۂ کلام بھی مختصراً درج کیا ہے مگر اپنے اشعار کا انتخاب مفصل طور پر دیا ہے۔مؤلف نے تذکرہ میں سادہ اور سلیس زبان کا استعمال کیا ہے مگر شعراء کے نام اور القاب میں نثر مسجع کا استعمال کیا ہے۔اس تذکرے کے خطی نسخے اس طرح ہیں:

(۱) دانشگاہ لاہور(جلد اول)

(۲) نذیر احمد ش ۷۳

حواشی وتعلیقات

(۱) فارسی تذکرہ نویسی در ہندرو پاک،سید علی رضا نقوی،ص ۵۲۱۔
(۲) ایضاً،ص ۵۲۲۔
(۳) شرح گلگشتی قلمی،رتن سنگھ زخمی،ص ۲۔
(۴) ریاض الفصحاء،غلام مصحفی ہمدانی،ص ۱۲۹۔
(۵) تذکرہ ہائے فارسی،احمد گلچین معانی،ج ا ص ۹۷۔
(۶) فارسی تذکرہ نویسی در ہندرو پاک،سید علی رضا نقوی،ص ۵۲۱۔
(۷) ایضاً ص ۵۲۱۔
(۸) ایضاً ص ۵۲۱۔
(۹) ایضاً ص ۵۲۱۔
(۱۰) ایضاً ص ۵۲۱۔
(۱۱) ایضاً ص ۵۲۲۔
(۱۲) تذکرہ انیس العاشقین،نسخہ خطی،ج ۲۔
(۱۳) تذکرہ انیس العاشقین،دیباچہ۔
(۱۴) ایضاً،ص ۱۳۸۔
(۱۵) ایضاً،ص ۸۲۔

☆☆☆

امیر خسروؔ کی ایک اہم مثنوی: نہ سپہر

ڈاکٹر سید محمد میاں زیدی، پی ایچ ڈی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ۔

ہندوستان کی جن شخصیتوں نے زمان و مکان کی حدود و قیود سے نکل کر اپنے فن اور ہنر سے دنیا کو متاثر کیا ہے ان میں امیر خسروؔ کا مقام نہایت بلند ہے۔ اس جامع الکمالات ہستی نے علوم و فنون کے مختلف میدانوں میں جو کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں وہ مثالی ہونے کے ساتھ ساتھ حیرت انگیز بھی ہیں۔ امیر خسروؔ ترکی النسل تھے ان کے والد امیر سیف الدین محمود ترکوں کے قبیلے ہزارہ لاچین سے تعلق رکھتے تھے۔ امیر خسروؔ کا اصل وطن کش شہر تھا۔ ان کے خاندان کے لوگ چنگیز خاں کے زمانہ میں بلخ اور بخارا کے آس پاس آباد تھے چنگیز خاں کے حملوں سے تباہ و برباد ہونے کے بعد اس خاندان کے افراد مختلف مقامات پر عارضی قیام کے بعد ہندوستان وارد ہوئے۔ جس عہد میں امیر خسروؔ کا خاندان ہندوستان آیا اس وقت دہلی کے تخت پر شمس الدین ایلتتمش کی حکومت تھی۔ (۱)

امیر سیف الدین محمد دہلی کے قریب ایک مقام پٹیالی پر آباد ہو گئے آج یہ مقام اتر پردیش کے ضلع ایٹہ میں ہے۔ ہندوستان میں آباد ہونے کے بعد امیر سیف الدین نے عماد الملک کی بیٹی سے شادی کر لی۔ عماد الملک جو کہ سلطان ایلتتمش کے عہد سے سلطان بلبن کے دور حکومت یعنی (۱۲۸۶ء۔۱۲۶۶ء) تک عرض ممالک کے عہدے پر فائض رہے۔ دبدبہ و حشمت کا یہ عالم تھا کہ بہ یک وقت دو سو ترک غلام، دو ہزار ہندو اور دو ہزار سوار برابر ان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ (۲)

معروف محقق ضیاء الدین برنی اپنی معرکتہ الآرا تصنیف ''تاریخ فیروز شاہی'' میں لکھتا ہے کہ عماد الملک نے اپنے زمانے میں اتنے گاؤں وقف کئے تھے کہ فیروز شاہی عہد تک لوگوں نے ان اوقاف سے گذر بسر کیا۔ (۳)

اسی جاہ و حشمت کے مالک عماد الملک کی بیٹی سے قدرت نے انہیں تین فرزند اور ایک دختر عطا کئے۔ تینوں بھائیوں میں اعزالدین علی شاہ سب سے بڑے، یمین الدین خسروؔ منجھلے اور حسام الدین قتلغ سب سے چھوٹے تھے۔ ان تینوں میں خسروؔ سب سے زیادہ ذہین اور فطین تھے۔ خسروؔ میں شاعری کا ذوق بچپن سے ہی تھا اور کم سنی میں ہی وہ بآسانی شعر موزوں کرنے لگے تھے جس کو سن کر سامعین متعجب رہ جاتے تھے۔ امیر سیف الدین نے امیر خسروؔ کی تعلیم کا معقول انتظام کیا۔ ان کی توجہ اور طبیعت کا میلان دیگر علوم کی نسبت شاعری کی طرف زیادہ تھا، خود لکھتے ہیں:

> ''میرے والد مجھے مکتب بھیجا کرتے تھے لیکن میں ردیف اور قافیے کے چکر ہی میں رہتا تھا۔ میرے قابل استاد عزیز الدین محمد خطاط، جو عام طور پر قاضی کے لقب سے مشہور تھے مجھے خوش نویسی سکھانے کی کوشش کیا کرتے تھے لیکن میں مہ جبینوں کے خط کی تعریف میں شعر کہتا تھا اور اپنے استاد کی پوری کوشش کے باوجود جوطرۂ یار کی طرح دراز اور مسلسل تھی میں زلف اور خال کے شوق سے باز نہ آتا۔'' (۴)

امیر سیف الدین کا انتقال امیر خسروؔ کے بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ والد کے انتقال کے بعد خسروؔ کی سرپرستی ان کے نانا عماد الملک نے کی۔ عماد الملک کی نگرانی میں خسروؔ کی تعلیم و تربیت جس کا والد کے انتقال کے بعد ناقص اور ادھوری رہ جانے کا خدشہ تھا شفیق نانا کی خاص توجہ کے سبب نہایت عمدگی سے مکمل ہوئی اور انھوں نے عربی و فارسی کے ساتھ ساتھ سنسکرت میں بھی مہارت حاصل کی سنسکرت زبان کی گونا گوں خصوصیات کی بنا پر وہ اس سے بہت متاثر تھے۔ اپنی ''مثنوی نہ سپہر'' میں خاص طور پر اس کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ زبان رتبے میں عربی سے تو کم ہے لیکن دری (فارسی) سے

بڑھ کر ہے۔

وینست زبانی بصفت در دری
کمتر از عربی و بہتر از دری

خسرؔو صاحب تصانیف کثیرہ تھے۔مختلف محققوں اور تذکرہ نگاروں نے ان کی تصانیف کی تعداد الگ الگ بتائی ہے۔جامؔی کے مطابق خسرؔو کی تصانیف کی تعداد ننانوے(۹۹) تھی اسی بیان کی دوسرے تذکرہ نویسوں نے بھی نقل کیا ہے۔(۵)

تفصیل سے قطع نظر سطور ذیل میں خسرؔو کی ایک اہم مثنوی ''نہ سپہر'' کا مختصر تعارف پیش ہے۔

امیر خسرؔو نے ۷۱۸ھ بمطابق ۱۳۱۸ء مین قطب الدین مبارک شاہ خلجی ۷۱۶ھ ۱۳۱۶ء کی فرمائش پر مثنوی ''نہ سپہر'' لکھی۔جس کے عوض میں بادشاہ قطب الدین مبارک شاہ نے امیر خسرؔو کو ہاتھی کے برابر تول کر روپیہ دئے۔یہ مثنوی نو حصوں پر منقسم ہے اور ہر حصہ میں اشعار کی تعداد الگ الگ ہے کسی میں کم اور کسی میں زیادہ۔عام مثنویوں کی طرح خسرؔو نے اس مثنوی کی شروعات حمد ونعت سے کی ہے۔ایک خاص بات جو فن عروض کے تعلق سے نہایت اہم ہے وہ یہ کہ خسرؔو نے اس مثنوی کے ہر سپہر کو الگ الگ بحروں میں نظم کیا ہے جس کی تفصیل اس طرح ہے۔

۱۔سپہر اول۔متقارب مثمن محذوف:خسرؔو نے اس کی ابتداء حمد،نعت اور منقبت اپنے پیر ومرشد محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء سے کی ہے۔اس کے بعد مدح بادشاہ اور بادشاہ کی تخت نشینی کی تفصیل درج کی ہیں۔خسرو خاں کی قیادت میں مبارک شاہ کو جنوب کی جانب بھیجنا اور خسرو خاں کا راجہ رام دیو کے ظالم وجابر نائب راگھو پر فتح حاصل کرنے کے بعد دہلی واپس آنے تک کی اطلاعات اس سپہر سے فراہم ہوتی ہیں۔خسرؔو نے اس سپہر کو رزمیہ شان میں لکھا ہے اور حسب معمول دہلی کے تخت وتاج کے لئے سخت الفاظ کا استعمال کیا ہے۔

۲۔سپہر دوم۔متقارب مثمن سالم:اس سپہر میں خسرؔو نے قطب الدین مبارک شاہ کی تعمیر کی ہوئی عمارتوں کا بیان کیا ہے۔اس سپہر میں تلنگ اور وارنگل کی مہموں،شہر دہلی کی تعریف اور اس کی فضیلت کا بیان،بغداد،قاہرہ،خراسان،ترمذ،تبریز،اصفہان،بخارا اور خوارزم کا ذکر کیا ہے۔جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا ہے اس بحر یعنی ''بحر متقارب مثمن سالم'' سے اس سپہر میں ایک خاص طرح کا ترنم اور موسیقیت پیدا ہوگئی ہے۔

۳۔سپہر سوم۔رجز مسدس مطوی:سپہر سوم ''رجز مسدس مطوی'' پر مشتمل ہے جو نسبتاً طویل ہے اور اپنے محتویات کی بنا پر اہمیت کا بھی حامل ہے۔امیر خسرؔو کی ہندوستان سے محبت کے جذبات جو انکی گذشتہ مثنویوں میں دبے رہ گئے تھے وہ اس سپہر میں ابھر گئے ہیں۔اس سپہر میں ہندوستان کے باشندوں کی ذہانت،استعداد علمی،زبانوں،رسم ورواج اور مذہبی عقائد وغیرہ کے متعلق اہم اور دلچسپ معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

حکمت و دانائی و علم ہنر
وانچہ کہ در ہند معانیست دگر(۶)

سپہر کے آخر میں ہر پال دیو کی وارنگل کی مہم پر اس کی شکست اور خسرو خاں کی فتح،فوج کی دہلی واپسی اور خوشی کے جشن کا بیان ہے۔

۴۔سپہر چہارم۔رمل مسدس محذوف:یہ سپہر پند ونصیحت پر مشتمل ہے۔خسرؔو نے صاف گوئی اور دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بادشاہ سے لے کر رعیت کے ادنیٰ آدمیوں تک خطاب کرتے ہوئے ان کے فرائض سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

۵۔سپہر پنجم۔خفیف مسدس مجنون ومحذوف:خسرؔو نے اس سپہر میں ہندوستان میں پڑنے والے جاڑے کے موسم کا بیان کیا ہے۔بادشاہ کا شکار کرنا اور سیر کے لئے جانا،بادشاہ کی کمان اور تیر میں عشق ومحبت کے راز ونیاز کو دیکھنا۔اس سپہر کے آخری حصے میں خسرؔو نے صوفیوں کے نقطۂ نظر کو مثالی شکل میں پیش کیا ہے۔مجموعی حیثیت سے یہ سپہر دل نشینی اور جاذبیت کی ایک عمدہ مثال ہے۔

۶۔سپہر ششم۔ہزج مسدس مقصود ومحذوف:خسرو نے اس سپہر میں علم نجوم سے اپنی دل چسپی اورمہارت کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔شہزادہ محمد کی ولادت، زائچہ اور فالنامہ،شہزادے کی تعلیم اوراس کے مستقبل کے متعلق پیش گوئی اور دعائے خیر کا ذکر کیا ہے۔

علم دگر ہر چہ ز معقول سخن
بیشترے ہست ز آئین کہن(۷)

۷۔سپہر ہفت۔رمل مسدس مقصود:اس سپہر میں خسرو نے موسم بہار کا بیان اور شہزادے کی پیدائش پر دہلی کے آرایش اور خوشی کے جشن،شراب اور آلات موسیقی کا بیان کیا ہے جس کی بنا پر مثنوی کا یہ حصہ نہایت دل چسپ ہو گیا ہے۔

حجت نہ آنست کہ از نغمۂ تر
تیر خورد آہوے صحرا بجگر
رفت چو در گوش دروں بانگ ترس
در رسد آہو کہ بنا شد جرس(۸)

۸۔سپہر ہشت۔ہزج مسدس اخرب مقبوض ومحذوف: یہ سپہر بھی سپہر پنجم کی طرح بے مزہ اور پھیکا ہے۔اس سپہر میں بھی عشق حقیقی کے مسائل کو چوگان اور گیند(گری) کے مناظرے کی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔پھر بھی کہیں کہیں تغزل نہایت عمدہ انداز میں پایا جاتا ہے۔

۹۔سپہر نہ۔رمل مسدس مجنون ومحذوف:اس سپہر میں مثنوی کا خاتمہ،دہلی کے شعراء کے ساتھ ساتھ اپنی تعریف،مثنوی کی تعریف اور خامیوں کے لئے معذرت وغیرہ کیا ہے۔مجموعی طور پر اس سپہر کو دلچسپ کہا جا سکتا ہے۔

نمونہ کے طور پر مثنوی کے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

بنزدیک قلعہ است ارم کندہ جالی	بلند ونمایندہ نزہت فزالی
سوی راستش از بلندی برآمد	چناں کش نظر سوئی آں منظر آمد
نگہ کردو دید آسمان وش حصاری	نہ پیدا امیاں زمینش کناری
نہ پیر امنش چشمۂ وباغ وبستان	فزایندہ عیش عشرت پرستان
ہمہ میوہ اش نغزک وموز وکتھائی	نہ چون سیب بس وخنک چوں سفرجل
ہر آن بو کہ آمد ازاں سو پیاپے	ہمہ بوئی گلہائی ہندوز دازوی
ہمہ چنپہ وکیورہ بوی در بوئی	ہمہ بیل گل درگل وروی درروی(۹)

دہلی کی بعض عمارتوں کی تعریف میں چند اشعار ملاحظہ ہوں:

رسیدند بنیاد کاران دانا	بہ بل بر رخ بادستن توانا
گزی بر کف و رشتۂ ہم نہفتہ	گہ عام بیدار و در سیر خفیۃ
بہر سو کہ فرمودہ گز را اشارت	عمود ترازو شدہ در عمارت
بہر جا کہ آآن رشتہ را سازبستہ	رگ جان سنمار نعمان گسستہ
بیاپی مہیا شد اندر دو بدن	کہ نابد در اندیشۂ ہوش مندان

بہر سوی گر دون شد اندر دویدن بیاری کہ گردوں نیارد کشیدن
ببالائی گردون زحل کردہ خانہ دو چرخی فیرود از دونورش روانہ
زحل راندہ دو تور را غیر پالان ز آثار دو نور دو چرخ نالاں
بیاوردن سنگ مزدور سنگیں سلب کردہ از گرد شبرنگ رنگین
بہر سوی رازی شدہ کارسازی ملک زادۂ کار فرمائی رازی
بہ تعجیل کردند اندک اساسی کہ باشد اساس عمل را قیاسی
چو محراب دارالخلافہ بر آمد در آمد خلیفہ چو جمہ درآمد
درد روز آدینہ را کرد گلشن ز نور تعبد چو خوردشید روشن(۱۰)

خوبی آب وہوا

ہند چو فردوس شد از حجت من بہر ہوایش کنوں آیم بسخن
دہ شمرم حجت قاطع کہ درو بہ ز خراسانست ہوا در ہمہ سو

حجت اول

اولش آں شد کہ در و آومیاں از و مۂ سرد نہ ن نیند زیاں
شیر صفت مرد بیک توئی قبا گرم چو شیر است گرش نیست عبا
نے چو خراساں کہ حسن از برف فزوں سرو بیاز بست بدہ شقہ دروں

حجت دوم

دویمست آں کاہل خراساں اگر ہر کہ براں سوست ز سرماشدہ کر
نشنود ایں گفت و بر ایں و ارجناں طعنۂ گرماش زند شعلہ زناں
پاسخ اومانہ کہ پیغامبر ما گفت بدانسانکہ بود در خورما
آنکہ بگر ماست ہماں رنجش و بس لیک شود کشتہ ز سرماہمہ کس

حجت سوم

سیومش آں کیں طرف از بیم ہوا کم طلبد مفلس کم مایہ نوا
کش نہ بدل پری سیمی گذرد گاہ دیش ہم بگلیمے گذرد
ہندوئے دہقاں بکہن چادر کی شب بچرا گاہ برباخرکی
بر لب جو آب خنک برہناں غسل کنند آخر شب غوطہ زناں
خود گہ گر مانبود شاں غم خز سایۂ شاخے بس و از کلبہ دوگز

حجت چہارم

چارم شان کیں طرف از سبزہ و گل ہست ہمہ سال بہار و گل و مل

نے چو خراساں کہ دو سہ ہفتہ گلش آمد و بگذشت چو سیلی زپلش

حجت پنجم

پنجمش ایں کاں گل شاں روی بردی رنگ خوش و چوں گل بابونہ درد

حجت ششم

ہست ششش ایں کاندک اگر پوست دراں خشک شود بونزند ز د بکراں
ویں گل ما بعضے اگر خشک شود طبلہ دروں نافۂ از مشک شود

حجت ہفتم

ہفتمش آں کاں طرف از میوہ تر نیست چو امرود چو انگور دگر
می کندم پاسخ ایں ہر دوکری نغزک و موزی و بناتی بمری
میوہ دگر کم نگری کز محلش لاچی وکافور وقر نقل بدلش

حجت ہشتم

ہشتمش آں شد کہ بسے میوۂ شاں ہست بہند وسوئ شاں زیں نہ نشاں

حجت نہم

ہست نہم آنکہ کشور خوش ہست در تحفہ کہ بود نادرہ وش
میوۂ بے خستہ کہ نبود بجہاں برگ کہ چوں میوہ خورد مہماں
موزہماں میوۂ بے خستہ نگر برگ زتنبول نگر نائب خور

حجت دہم

ہست دہم آنکہ چوں تنبول گزیں میوہ بناشد بہمہ روے زمیں
کاہل شکم ذوق نگیرند دراں جز ہمہ مہتروش و مہتر پسراں
خاصۂ آں نیست برائے ہمہ کس جز ز پئے قطب فلک پایہ و بس(۱۱)

جذبۂ وفا زنان ومردان ہند

ہست عجب مردن ہندو بوفا مردنش از تیغ و ز آتش بجفا
زن ز پئ مرد بسوزد بہوس مرد ز بہر بت ویا منعم و بس
گر چہ در اسلام روانیست چنیں لیک چوبس کار بزرگ ست بہ بیں
گر بشریعت بود ایں بوع روا جاں بد ہند اہل سعادت بہوا(۱۲)

تلقین اوصاف حکمرانان ہند

پنج بنا شرط جہانداریست آید از وکش ز خدایاریست
اولش آنست کہ در کار تخت رائے بود محکم و تدبیر سخت

کار گذاران بشه کام گار
باز نمایند سرانجام کار

دومش آنست کہ عزم و سکون
بر محل افتد ز درون و بروں

سیومش آنست کہ در حزم خویش
وور کند پردۂ عقلت زپیش

آنکہ سرخویش ندارد نگاہ
کے سر غیرے رہدش در پناہ

چارمش آں شد کہ بانصاف و داد
بازہ کند گلشن ویں راسواد

تاکہ و مہ زاہل خراش و خروش
نشنود آواز تظلم بگوش

پنجمش آں شد کہ نماید مدام
جہد درآسودگی خاص و عام

بر ہمہ وارد بہ بیابان و کاخ
جاخوش درہ ایمن و نعمت فراخ

آنچہ بفہرست رقم یافت چست
باز نمایم بہ بیان درست(۱۳)

حواشی وتعلیقات

۱۔تذکرہ الشعراء دولت شاہ سمرقندی ص ۲۳۸ نفحات الانس ملا عبدالرحمٰن جامیؔ،ص ۲۱۰
۲۔دیباچہ غرۃ الکمال از امیر خسروؔ دہلوی
۳۔تاریخ فیروز شاہی،ضیاءالدین برنی ص ۱۱۷۔۱۱۵
۴۔دیباچہ تحفۃ الصغر از امیر خسروؔ دہلوی،ص ۲۔۳
۵۔برائے تفصیل ملاحضہ ہو آتش کدہ آزر(اشپرنگر)ص ۱۹۲ نفحات الانس جامی ص ۱۱۔۱۰ے،گلزار ابراہیم علی ابراہیم خاں خلیلؔ وغیرہ
۶۔مثنوی نہ سپہر،امیر خسروؔ دہلوی،بپٹسٹ مشن پریس کلکتہ ۱۳۳۷ھ،۱۳۱۸ءص ۱۴۸۔۱۴۹
۷۔ایضاً ص ۱۶۱
۸۔ایضاً
۹۔مثنوی ''نہ سپہر'' دوسرا سپہر امیر خسروؔ دہلوی
۱۰۔ایضاً
۱۱۔ایضاً،ص ۱۵۸۔۱۵۹۔۱۶۰۔۱۶۱
۱۲۔ایضاً،ص ۱۹۴تا ۱۹۵
۱۳۔ایضاً،ص ۲۸۔۲۹

☆☆☆

حضرت شاہ تراب علی قلندر اور ان کی صوفیانہ شاعری

ناظرہ اسحاق، شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

حضرت شاہ تراب نے ۱۱۸۱ھ بہ مطابق ۱۷۶۸ء میں ولادت پائی۔ ایام طفلی سے ہی حسن استعداد اور صلاح وتقویٰ سے آراستہ تھے۔ حسنِ ادب اور حسنِ خدمت کی وجہ سے اپنے والد ماجد (حضرت عارف باللہ شاہ محمد کاظم قلندر قدس سرہٗ) کے بہت چہیتے تھے۔ ملاّ قدرت اللہ بلگرامی اور مولوی معین الدین بنگالی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور ملا حمید الدین محدث کاکوروی سے بقیہ درسیات پڑھے۔ قاضی القضاۃ نجم الدین علی خان بہادر ثاقب کاکوروی سے فن عروض اور مولوی فضل اللہ ساکن نیوتنی سے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ چونکہ آپ نے متبرک اور قابل تقلید فضا میں آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا تھا، طاہر اور پاکیزہ ماحول میں سرابھارا تھا لہٰذا بے ثباتی اور فنائیت کی جوش انگیز صداؤں نے کانوں کو پہلے ہی سے بے حقیقتی سے آشنا کر دیا تھا۔ والد محترم حضرت عارف باللہ کی حق بین نگاہ نے فرزند رشید کی استعداد ملاحظہ فرمائی تو بذاتِ خود تصوف کی تعلیم دینا شروع کر دی اور تیسیر الاحکام مصنفہ شہاب الدین ملک العلماء، راد آلاخرت، منہاج العابدین، کیمیائی سعادت اور تصانیف شاہ ولی اللہ محدث دہلوی پڑھائیں۔ جب سات سال کے ہوئے تو ذکر سہ پایہ اور نماز تہجد کی بھی تعلیم فرمائی۔ نشست و برخاست، خلوت وجلوت میں معرفت وتوحید کے سلسلہ میں زبانی تعلیم کے ساتھ ساتھ عملی تعلیم بھی فرماتے رہتے تھے۔ والد ماجد کی ہمہ وقت صحبت فیض نظری اور کیمیا اثری سے صاحبزادہ صاحب کے جوہر خوب کھلے۔ اور ایک دن والد محترم سے عرض کیا کہ توحید و معرفت کا مجھے ایسا یقین ہو گیا ہے جو کسی اعتراض سے نہیں جا سکتا۔

آپ کا یہ معمول تھا کہ جب والد محترم کسی کو کوئی نماز یا دعا بتاتے تھے تو آپ اس کو فوراً زبانی یاد کر لیتے تھے اور کبھی آپ کی نمازیں قضا نہیں ہوئیں۔ جیسا کہ اس بارے میں روض الازہر میں ایک جگہ بیان کیا گیا ہے۔ ''در کثرت عبادت از صبی تا شیخوخت بر یک حال بودند واز اں روز کہ شعور بہم رسانیدند نماز را القضا نہ خواندند۔''

ایام طفلی سے ہی آپ کو مبشرات غیبی کا ظہور ہونے لگا تھا اور اندرونی اثرات روحانی مراتب کا پتہ دینے لگے تھے۔ بچپن میں دو مرتبہ آپ حضرت جبرائیلؑ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ ایک مرتبہ قحط کے زمانے میں حضرت جبرائیلؑ نے خواب میں بشارت دی اور آپ کو قحط کے دفعیہ کے لیے یہ طریقہ تعلیم فرمایا کہ دو رکعت نماز وقت ظہر شب برات کے روز اس طرح پڑھو کہ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد چودہ مرتبہ اقرأ پڑھو۔ آپ نے اس پر عمل کیا یہاں تک کہ قحط دور ہو گیا۔

دوسری مرتبہ دیکھا کہ حضرت جبرائیلؑ آئے اور فرمایا کہ آؤ تم کو ایک اور نماز بتاؤں۔ پھر چار رکعت بتائیں جس میں سورۂ والشمس اور واللیل وغیرہ پڑھنے کو بتائیں اور فرمایا کہ اس نماز کو عیدالاضحیٰ کے روز بیٹھ کر پڑھنا چاہئے۔

آپ پندرہ سال کی عمر میں ہی تمام مراتب ارشاد وتلقین سے فارغ ہو گئے تھے۔ غرض یہ کہ استعداد خداوندی خوش نصیبی اور توفیق الٰہی نے مخلوط ہو کر وہ شان پیدا کر دی کہ کمسنی میں ہی ان تمام دشوار گزار مراحل سے گزر گئے جو ہر سالک کے لئے ناگزیر ہیں۔ والد بزرگوار نے فرزند کی عبادات و اشغال میں محویت ملاحظہ فرمائی تو کاروبار خانقاہی وخانہ داری سپرد فرما دیئے، یہاں تک کہ شجرہ نویسی کی اہم کتابت بھی آپ کے سپرد فرما دی۔ اس وقت سے ہر کام آپ ہی کیا کرتے تھے۔ لیکن اس مصروفیت کے باوجود کبھی کسی شغل یا وظیفہ میں ذرہ برابر بھی فرق نہ آیا۔

سترہ (۱۷) سال کے ہوئے تو آپ کا نکاح شیخ محمد عوض بن شیخ محبّ الرحمٰن بن شیخ عبدالرحمٰن علوی کی چھوٹی صاحبزادی سے ہوا۔ آپ کے دو

صاحبزادے حضرت قطب الافراد مولانا شاہ حیدر علی قلندر اور حضرت مقتدائے جہاں مولانا شاہ تقی علی قلندر اور ایک صاحبزادی پیدا ہوئیں۔

تمام دنیاوی لوازمات اور ذمہ داریوں کے باوجود روزانہ کے نظام الاوقات میں بال برابر بھی فرق نہ آتا تھا۔ کاروبار اور خدمت گزاری میں ہر وقت مصروف رہتے تھے اسکے باوجود دو سو رکعت نماز نفل روزانہ ادا کیا کرتے تھے۔ والد بزرگوار بھی یہ ہمت و استقلال دیکھ کر حیران تھے۔ چنانچہ آپ کی عالی ہمتی کو سراہتے ہوئے فرماتے ہیں:

''برتراب علی تمام بار خانگی افتادہ است من حیرانم کہ چگونہ بسری دارد خداش جزائے خیر دہد و دنیا و آخرت ہمہ تابع او باشد و مولاش در دل آنچناں بود کہ ہیچ پروائی دو جہانش نباشد''۔

والد محترم اکثر فرماتے تھے کہ مجھے تم پر بہت ترس آتا ہے کہ ان لوازمات کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہو اور تکلیف اٹھاتے ہو۔ مگر تمہارے علاوہ مجھے ایسا کوئی نظر بھی تو نہیں آتا جو اس کو سنبھالے۔

آپ نے چالیس سال تک اپنے والد محترم کے زیر سائے رہ کر ہر طرح کی تعلیم حاصل کی اور مجاہدات و ریاضات کئے اور اسم یا باسط، سورۂ فاتحہ، یا رحیم، حروف تہجی با مؤکلات اور دعائے سیفی وغیرہ کی بھی زکوتیں دیں۔ جیسا کہ حضرت تراب فرماتے ہیں۔

''تربیت و تعلیم من در علم طریقت و تصوف ہمہ لذ والد خود است تمام عمر در صحبت آنحضرت گذرانیدم و از طفلی اذکار و اشغال قلندریہ وغیرہ یافتم ہمیشہ در صحبت آنحضرت می گزشت از ہر علم سلوک و تصوف و حقایق و معارف خود آگاہ میفرمودند۔ و بارہا از زبان مبارک خود فرمودند کہ ترا اجازت این ہمہ میدہم و مکرر کتاب انتباہ وغیرہ مصنفہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کہ مشتمل بر بیان طرق و سلاسل بود خوانا نیدہ ارشاد کردند کہ شمارا بریں ہمہ سلاسل اجازت می دہم و محتاج ترتیب کسی نمی گذارم۔ فقط بیعت کردن از حضرت شاہ مسعود علی قلندر کہ پیرزادہ و صاحب سجادہ مرشد من اند باید کہ این رسم پیراہن من است در سالیکہ قصد بردن من و مگڈھ مصمم بود خود ازین جہان فانی بہ عالم جاودانی رحلت فرمودند''

والد محترم کے وصال کے بعد حضرت تراب سید نا شاہ مسعود علی قلندر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے بیعت کی اور ان کے مریدینِ خاص میں شامل ہوئے۔

آپ کثرت مشاغل ارشاد و تلقین اور فرائض سجادگی کے باوجود تصنیف و تالیف بھی فرماتے رہے۔ آپ کی متعدد تصنیفات و تالیفات ہیں۔ جن میں سے کچھ کا ذکر حسبِ ذیل ہے:

۱) اصل المعارف:- یہ ایک مثنوی ہے جو آپکی سب سے پہلی تالیف ہے جس کو آپ نے مولوی شفاعت علی کاکوروی کے اصرار پر مقامات عشرۂ طریقت رسالۂ تعرف کو نظم فرمایا حضرت عارف باللہ نے اسکو بہت پسند فرمایا۔ یہ مثنوی آپ کے منظوم کلام کے ساتھ دو مرتبہ چھپی تھی مگر اب ناپید ہے۔

۲) اصول المقصود:- یہ دراصل حضرت عارف باللہ کا ملفوظ ہے اور ضمناً تمام حضرات مرشدین کے بھی حالات ہیں اس کو آپ کے مرید منشی امتیاز علی وکیل کاکوروی وزیر بھوپال نے ۱۳۱۲ھ میں چھپوایا تھا اور اب یہ بھی ناپید ہے۔

۳) مجمع الفوائد:- اس میں مختلف مضامین تصوف اور سلوک و ادعیہ و اعمال ہیں جس کو آپ نے حضرت عاف باللہ کی بیاض سے نقل کر کے مرتب فرمایا۔

۴) فتح الکنوز:- اس میں شیخ و مرید کے آداب اور کچھ مضامین حقایق و معارف کے بھی ہیں۔

۵) مقالات صوفیہ:- اس میں آپ نے حضرات اولیاء اللہ کے ارشادات تذکرۃ الاولیاء نفحات اور رشحات وغیرہ سے لے کر جمع فرمائے ہیں۔

۶) شرائط الوسائط:- اس میں پیرومرید کے آداب، مشائخ کی بیعت وخلافت کے مسائل وغیرہ بالتفصیل تحریر فرمائے ہیں۔

۷) کشف المتوری فی حال نظام الدین قاری:- اس میں آپ نے حضرت مخدوم نظام الدین قاری معروف بہ شاہ بھیکہ کا کوروی اور ان کی اولاد کے واقعات بیان کئے ہیں اور اسکے علاوہ اس میں اپنے نسبی حالات بھی تحریر فرمائے ہیں۔

۸) مطالب رشیدی:- یہ کتاب اپنی نظیر آپ ہے۔کوئی مسلہ معاش ومعاد وشریعت ایسا نہیں جو اس کتاب میں نہ ہو۔موجودہ دور کے لیے یہ کتاب ایک دستورالعمل ہے۔آپ کی تمام تصانیف مین جتنی شہرت ومقبولیت اس کتاب نے پائی کسی نے نہیں پائی۔اس کو آپ نے ۷۵ سال کی عمر میں اپنے ایک خاص مرید مولوی رشیدالدین خاں خلف مفتی خلیل الدین خاں بہادر سفیر شاہ اودھ کی تعلیم کے لیے تحریر فرمایا تھا۔

۹) مجاہدات الاولیاء:-اس کتاب میں آپ نے اولیائے متقدمین ومتاخرین اور حضرات قلندریہ کے ریاضات ومجاہدات قلم بند کئے ہیں۔

۱۰) اسنادالمشیخت:- اس میں بیعت وخلافت کے اقسام واحکام نیز خرقہ پوشی کا بیان بالتفصیل بیان کیا گیا ہے۔

۱۱) تعلیم الاسماء:- اس میں تمام اعمال واورادا وراداعیہ وسورقرآنی وغیرہ کے طریقے باز کوٰۃ وشرائط نہایت شرح وبسط سے تحریر فرمائے ہیں۔

ان کتابوں کے علاوہ آپ کے مکتوبات بھی ہیں جو امیر عاشق علی خان بہادر کاکوروی سفیر شاہ اودھ کے نام حقائق ومعارف کے سلسلہ میں ہیں۔

کلام حضرت تراؔب علی قلندر:

آپ کو شعروسخن کا ذوق بھی اللہ تعالیٰ نے فطرتاً عطا کیا تھا۔آپ شعروشاعری کے میدان میں تراؔب کے نام سے معروف ہوئے۔شاعری کو آپ نے نہ کبھی نام ونمود کا ذریعہ بنایا اور نہ کبھی اہل نظر سے داد وتحسین کے خواہش مند رہے۔آپ نے صرف اپنی تسکینِ خاطر کے لیے اپنی معنوی صلاحیتوں سے راستہ کی آمدورفت میں الہامی طرزِفکر کو اپنایا۔تکیہ شریف پر بیٹھ کر کبھی کوئی شعر نہیں کہا۔بلکہ بستی کی آمدورفت میں ایک دوغزل کہہ لیا کرتے تھے۔اردواشعار کو معیت میں رہنے والے ایک عزیز قلم بند کرلیا کرتے تھے مگر فارسی کلام کو آپ خود ایک چھوٹی سی بیاض میں اپنے دست مبارک سے تحریر فرمایا کرتے تھے۔ایک غزل میں فرماتے ہیں:

صرف در شعر و سخن کردم نہ ایں فکر رسا
گو بنائی نیک درچاہ خراب انداختم

نظم ہو یا نثر اس وقت بھی اسی غرض سے لکھا جاتا تھا کہ اس سے کوئی نتیجہ نکال کر پڑھنے والوں کے ذہن نشین کرایا جائے۔اسی طرح غزل کے جو اشعار حسب حال کہہ کر لکھے گئے ہوں ان کے لیے مطابق واقعات ہونا لازم نہیں۔مثال کے طور پر حضرت صاحب بیان فرماتے ہیں:

کردم از دست جنوں صد جیب چاک
تا بکف آید مرا دامانِ عشق

اس شعر سے یہ نتیجہ نکالنا ضروری نہیں کہ حضرت صاحب نے واقعی عشق میں اپنے پیراہن شریف کا ایک ٹکڑا بھی کبھی چاک فرمایا ہو۔یہ بھی واضح رہے کہ ایسی افسانہ نویسی اور ایسے اشعار ''وانہم یقولون مالایفعلون'' کے تحت نہیں آتے بلکہ ایسے شاعر کا شمار تلامیذ الرحمٰن کے زمرہ میں ہوتا ہے کیوں

کہ وہ شاعر کے حسب حال ہیں اگر چہ کسی مفروضہ کے طور پر بیان کئے گئے ہوں۔

صوفی شعراء نے مبالغہ سے بہت کم کام لیا ہے لیکن حقایق ومعارف اور کیفیات وجذباتِ باطنی وعشق کو بیان کرنے کے لئے متعدد مقامات پر ان کو اصلاحات اور کلام کے لیے مختلف ملبوسات اختیار کرنے پڑے ہیں۔ انھوں نے ہدایت اور شفائے امراض روحانی نیز قلب ماہیت کرنے کے لئے صوفیہ صالحین سابقین کا اتباع فرمایا ہے اور شاعری کو ایک طریقہ علاج قرار دیا ہے کہیں نظم کی شکل میں، کہیں غزل کی صورت میں اور کہیں مثنوی اور ٹھمریوں کے ذریعہ۔ غرض کہ جیسا مریض ہوگا ویسا ہی اسکا علاج ہوگا۔ یہی وہ ارباب حال ہیں جو قلوب میں ہزار ہا سمندر لیے ہوئے ہیں مگر دریا کے کنارے تشنہ لب حیران کھڑے ہیں۔ شوق وعزیمت کے بڑے بڑے میدان اور مقامات عبور کر چکے ہیں لیکن قِدَم سے قدَم نہیں اٹھایا ہے۔ ان تمام تمہید سے یقینی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرات صوفیہ ارباب حال ہیں نہ کہ ارباب قال۔ حیات انسانی میں خفیف سی جنبش بھی ان کے مشاہدہ سے چھوٹنے نہیں پاتی رنج وغم سے دنیا بھاگتی ہے لیکن وہ فطرت کے نباض بن کر رنج وغم کو سودواؤں کی ایک دوا سمجھتے ہیں اس مقام پر یہی وہ صنف سخن ہے جس پر ''دانستنی است وگفتنی نیست'' کا مقولہ صادق آتا ہے اور متصوفانہ شاعری ویسے بھی ایمانیت کے تحت آتی ہے۔ حضرت ترابؔ کی شاعری جہاں عشق ومحبت، ہمدردی واخوت، خود داری وجفاکشی کا سبق پڑھاتی ہے وہاں تیغ وخنجر اور تیر ونشتر کے مسلسل کچوکے بھی لگاتی ہے جہاں اسکی درد بھری آواز دلوں کو تڑپاتی اور نمک چھڑکتی ہے وہاں دردمندانہ اور غم گسارانہ الفاظ واقوال دلوں میں گھر کرتے اور زخموں پر مرہم بھی لگاتے ہیں۔ ان کا مقصد شاعری نہیں بلکہ حسب حال کلام ہے۔ آپ کے معاصرین میں حضرت شاہ نیاز احمد صاحب بریلوی چشتیہ وقادریہ سلسلہ میں بڑے عاف وکامل گزرے ہیں ان کا کلام بھی وحدت والجود کے مسلہ پر بڑا دل نشین ہے اور قال مطابق حال بعض جگہ دونوں حضرات دوش بہ دوش نظر آتے ہیں۔ وحدت الوجود کی ایک غزل میں اپنے مخصوص مرشدانہ طرز کے مطابق دو شعر عوام کے لیے ارشاد فرماتے ہیں۔

چگو نہ پاک دامن مرد دنیا دار را گویم
کہ دنیا جیفہ ناپاک مرا دار است می دانم
اگر جنت ہوس داری کنارہ کن ز بدکاری
کہ دوزخ صورت اعمال و کردار است می دانم

حافظ شیرازی اور مولانا روم علیہ الرحمۃ کا رنگ آپکی شاعری میں جھلکتا دکھائی پڑتا ہے۔ یہاں مولانا رومؒ اس طرح فرماتے ہیں۔

سر سرّم جان جانم تن نیم — من نیم باللہ یاران من نیم
نور پاکم آمدہ درمشت خاک — کور چشمان را دلی روشن نیم
نور نورم نور نورم نور نور — من چراغ پنبۂ و روغن نیم

یہاں حضرت ترابؔ اسی مضمون کو کچھ اسی طرح بیان فرماتے ہیں:

نہ غم خوارم نہ غم دارم نہ دلدارم — نہ در خیرم نہ بی خیرم نہ در کارم نہ بی کارم
نہ مجبورم نہ مختارم، نہ منصورم نہ عطارم — نہ مخمورم نہ سر شارم نہ بیہوشم نہ ہشیارم
نہ باکس الفتی دارم نہ برکس شفقتی دارم — نہ خود باہیچ کس یارم نہ خود از ہیچ بیزارم
نہ در شہرم نہ ویرانہ، نہ در مسجد نہ بت خانہ — نہ در بزمم نہ کاشانہ نہ در دارم نہ دیوارم
نہ شیر نیم نہ فرہادم نہ قمری ام نہ شمشادم — نہ پابندم نہ آزادم نہ در دامی گرفتارم

ترابؔ از خود ہمہ محوم نہ در سکرم نہ در صحوم نہ اہل منطق و نحوم نہ از علمائی اخیارم

حضرت صاحب نے وحدت الوجود کو ہر جگہ اس طرح بیان فرمایا ہے کہ وحدت الشہود بھی ساتھ ساتھ قائم رہے اور مضمون میں دونوں رنگ سموئے ہوئے ہوں۔یعنی شرعی پہلو بھی مدنظر اور محفوظ رہے۔

ای بی تو ہستیم کو جان و بدن توہستی
من نیستم بجز تو ہستی من تو ہستی
گفتی نفخت زاں دم در پیرہن نہ گنجم
ہم کیستم کہ گنجم در پیرہن توہستی
از سخن اقرب تو پیدا شد است ایں بو
در جملہ دست و باز و چشم و دہن توہستی

''ہمت اوست'' کے بعد ''ہمہ از وست'' بیان فرماتے ہیں یہ بھی وحدت الوجود کا ہی ایک طریقہ ہے:

ای والہ تو بلبل ہم لالہ ہست ہم گل
مطلوب عندلیب و خوب چمن توہستی
سر سبز باغ از تو قمری بہ داغ از تو
ای قامتِ قیامت سرو سمن تو ہستی
ای شمع روی فیروز پروانہ از تودر سوز
دی مسہر عالم افروز نورِ زمن تو ہستی
ای لیلیٰ از تو مجنون دی قیس بر تو مفتوں
شیریں ہم از تو موزوں دی کو ہکن تو ہستی

یہاں تک مشاہدہ اور کثرت بیان فرما کر اور وحدت کو کثرت میں دکھا کر اطلاق کی طرف رجوع فرماتے ہیں یعنی وحدت کو وحدت میں دیکھاتے ہیں۔

مطلق بہ صد نہانی پنہان بصد عیانی
باکیست لن ترانی چون خویشتن تو ہستی

وحدت الوجود اور وحدت الشہود میں جو خفیف اور الجمالی فرق نظر آتا ہے اسے دیکھنے کے لیے ایک غزل مثال کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔

بہر دری کہ شدم شش جہت ترادیدم
بہ حیرتم کہ تو نادیدۂ کرادیدم

یعنی دید بھی برحق ہے اور نور حق کا نادیدہ ہونا بھی اور ان دونوں حالتوں کا بیک وقت حال ہونا بھی برحق ہے۔کیونکہ جمع اضداد اگر چہ محال ہے۔لیکن ذاتِ حق مجمع اضداد ہے اور اسی مفہوم کو دوسرے شعر میں اس طرح فرماتے ہیں۔

شہودِ ذاتِ منزہ زمن مپرس دلا

چگویم از تو کہ بی چون و بی چرادیدم

اس شعر میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ذاتِ منزہ اگر چہ مشاہدہ میں آسکنے سے بالاتر ہے لیکن میں یہ کیسے کہوں کہ میں نے اسے اس طرح بلا چون و چرا دیکھا ہے۔

خود است شاہد و مشہود و عارف و معروف
براہِ معرفت ایں طرفہ ماجرا دیدم
نہ واحد است نہ کلی نہ عین ہست نہ غیر
منش زحیلہ اضافات ماورئ دیدم

جب انا الحق کے رمز اور سر سے آگاہی ہوتی ہے تو اس کا برملا اظہار کرتے ہیں اور شریعت کو مدنظر رکھتے ہوئے تصدیق فرماتے ہیں۔

حق است آں کہ انا الحق بگفت ومی گوید
کہ غیر حق ھمہ بہتان و اِفترا دیدم

مقام ارشاد پر فائز ہوتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے کہ:

ہمہ بہ جانب معشوق می روند بہ شوق
ترابؔ را سوے عشاق رہگرا دیدم

حضرت ترابؔ ایک غزل میں محبت کا ذائقہ اور عشق کی چاشنی چکھتے ہوئے اور اپنی حالت کی ترجمانی کرتے ہوئے بیان فرماتے ہیں۔

خوردم از تیرنگہ پیکانِ عشق
کرد تیغ ابروم قربانِ عشق

اس کے بعد واعظ کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے چونکہ وہ دردِ عشق سے بے خبر ہے اور میرے حال و مقام کی اسے خبر نہیں ہے لہٰذا میری صحبت کے لائق نہیں ہے یعنی:

واعظ از حالم تر نبود خبر
از برم بر خیزای نادانِ عشق

مستقبل سے بے پروا اور بے نیاز ہوتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

ھر چہ بادا باد من سردادہ ام
در رہ سلطان عالی شانِ عشق

عشق کے گرانبار اِحسان کی بدولت اپنے آپ کو ننگ و ناموس سے فارغ سمجھتے ہیں اور بیان فرماتے ہیں:

فارغم کردہ است از ناموس و ننگ
ھست برمن ایں قدر احسانِ عشق

عشق کے فیضان سے سرشار ہو کر ارشاد فرماتے ہیں:

کیست محرم با کہ گویم حال خود

بادشاہ دقتم از فیضان عشق

مقطع میں عملی تعلیم دیتے ہوئے زور دیتے ہیں کہ اصل عشق یہی ہے:

تا بکی طال اللسان باشی ترابؔ
لب ببند و تن بزن ای جانِ عشق

مثال کے طور پر ایک غزل حسب ذیل بیان کی جاتی ہے جو آپ کے مقامِ ارشاد کا پتہ دیتی ہے۔ چنانچہ اپنی مرشدانہ رہبری میں عمل شرعی کی تعلیم دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

نیست دنیا جائی راحت از غمش ای دل برآ
رخت ازیں دار المحن بردار و زیں منزل برآ

''الدنیا مزرعۃ الآخرۃ'' (دنیا آخرت کی کھیتی ہے) کی تشریح کرتے ہوئے اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

مزرع عقبیٰ است دنیا نی مقرو عیش گاہ
تخم نیکی کشتہ زینجا باز مستعجل برآ

ہواو ہوس میں گرفتار رہنے پر تنبیہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

غرق باشی تا یکی در بحر فکر آب و نان
سر برآ از قعر دریا برلب ساحل برآ

''موتوا قبل ان تموتوا'' (یعنی اپنی طبعی موت سے پیشتر مرو) کی تعلیم دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

بعد مرگ آخر رود ایں قالب خاکی زتو
قبل مرگ ای جان من از قید آب و گلِ برآ

''اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول'' (اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو) کی تلقین فرماتے ہیں اور بیان کرتے ہیں:

باش محکوم خدا و تابع امر رسولؐ
چند باشی زیر حکم نفس و شیطان دل برآ

شریعت کے ساتھ ساتھ طریقت کی بھی تعلیم دیتے ہیں اور اہمیت بیعت کو بیان کرتے ہوئے اور اس سے الخراف سے خوف دلاتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

دست پیری گیر ورنہ رہبرت شیطان شود
طالب حق شو خدا را از رہ باطل برآ

حضرت صاحب کے نمونۂ کلام پر ہم جتنا بھی لکھیں کم ہی ہوگا آپ بے شک علوم روحانی کے معلم اور اسرارِ باطنی کے حکیم تھے اور اسی سبب ان کے کلام میں روحیانیت کی گہرائی اور وسعت نظر آتی ہے۔ اور قاری کو رموز مخفی سے آگاہی ہوتی ہے۔ تصوف کے بنیادی مسائل وحدت الوجود، طریقت کے مسائل، معرفت کے امور، تسلیم ورضا کی تلقین، صبر وقناعت کی ہدایت، ترک دنیا کا خیال، سکون قلب کی تدابیر، آفرینش کائنات کی حقیقت، کن فیکون کا مفہوم، حسن وعشق کے رموز، دنیائی فانی کی بے حقیقتی کا افسانہ اور اس کی بے ثباتی کا ترانہ، یوم الست کا وعدۂ وپیمان، تصفیۂ قلب اور تزکیہ نفس کی اہمیت

بخوبی موجود ہیں اور شخصی اجتہاد کی جھلک ان کے کلام میں نمایاں نظر آتی ہیں۔آپ کے کلام کی شہرت ومقبولیت آپ کے عہد میں ہی بام عروج پر پہنچ گئی تھی یہاں تک کہ غیر ہندوستانی بھی آپ کے کلام سے پوری طرح روشناس ہو چکے تھے۔

آپ ۹۴ سال کی عمر میں ۴/ جمادی الاولیٰ ۵ ۱۲۷ھ بہ مطابق ۱۸۵۸ء میں اس دنیا سے رخصت ہوئے اور ۵/ جمادی الاولیٰ کو بعد ظہر مابین قبر والدہ ماجدہ واہلیہ صالحہ حسب وصیت خود دفن ہوئے۔قاضی احمد علی خان عباس کاکوروی نے ان کی وفات کے تین سال بعد ایک عالی شان روضہ بنوایا اور آپ کا عرس شریف ۲۲/ ربیع الآخر کو ہوتا ہے۔تاریخ وفات پر فاتحہ بھی پڑھی جاتی ہے۔مولوی محی الدین خان ذوقؔ کاکوروی نے آپ کی تاریخ وفات این اشعار سے نکالی ہے:

سوز کدام حادثہ سر زد کہ ایں سپہر — جان حزیں بہ شعلہ ماتم کباب کرد

۱۲۷۵ھ — ۱۲۶۶ف

دانم کہ بدرِاوج حقیقت تراب شاہ — زینجایۂ عزم خلد مگر یا تراب کرد

۱۸۵۷ء — ۱۹۱۴سمت

کتابیات

۱- اذکار الابرار۔حضرت مولانا شاہ تقی حیدر قلندر۔ص ۳۸۵۔

۲- اصول المقصود۔حضرت شاہ تراب علی قلندرؒ۔ص ۳۵۶

۳- بہارستان تراب۔ص ۸

۴- روض الازہر فی ماثر القلندر۔حضرت مولانا شاہ تقی علی قلندر۔ص ۱۹۱۔

۵- کشف المتواری فی حال نظام الدین القاری۔حضرت شاہ تراب علی قلندر۔ص ۱۸۷۔

۶- نزہتہ الخواطر۔علامہ سید عبدالحی الحسنیؒ۔ص ۱۰۷۔

☆☆☆

عزیز احمد بحیثیت ناقد

مبشرہ صدف، ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی

عزیز احمد ناول نگار، افسانہ نگار اور ترقی پسند ناقد کی حیثیت سے اردو ادب میں اہمیت رکھتے ہیں۔ان کی پیدائش 1913ء میں حیدرآباد میں ہوئی۔عثمانیہ یونیورسٹی سے انھوں نے 1924ء میں بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔انگریزی سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی سے 1938ء میں انگریزی کے پروفیسر ہوئے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد وہ پاکستان چلے گئے۔وہاں مختلف عہدے کی سربراہی کی۔1958ء میں اسکول آف اورینٹل افریکن اسٹڈیز لندن میں پروفیسر ہوئے۔تاریخ یونیورسٹی سے شعبۂ اسلامیات سے 1920ء میں وابستہ ہوئے۔1982ء میں عزیز احمد کی وفات ہوگئی۔

عزیز احمد ناول نگار کی حیثیت سے اردو ادب میں بے حد مقبول ہیں۔تنقید اور تراجم پر انہوں نے اہم کام کیے۔ان کی تخلیقی، تنقیدی اور ترجمہ شدہ کتابیں ہیں۔(1) گریز (ناول) (2) مرمر اور خون (ناول) (3) ہوس (ناول) (4) آگ (ناول) (5) ایسی بلندی ایسی پستی (ناول) (6) شبنم (ناول) (7) ترقی پسند ادب (ادبی تنقید) (8) اقبال: نئی تشکیل (ادبی تنقید) (9) اقبال اور پاکستانی ادب (ادبی تنقید) (10) فن شاعری یا بوطیقا (ارسطو کی پوئٹکس کا ترجمہ) (11) طربیہ خداوندی (دانتے کی ڈیوائن کمیڈی کا ترجمہ) (12) بیکار دن بیکار راتیں (افسانوی مجموعہ)۔

اقبال: نئی تشکیل اور اقبال اور پاکستانی ادب کے ذریعہ ان کے تنقیدی نظریات کی وضاحت ہوتی ہے۔دونوں کتابوں میں اقبال کی شاعری کے چند نئے نکات پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ارسطو کا پوئٹیکس کا ترجمہ انھوں نے فن شاعری کے نام سے کیا یہ کتاب اردو ادب میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔اس کے علاوہ ان کے بہت سے مضامین ہیں جو ان کے تنقیدی خیالات کو واضح کرتے ہیں۔ان کی سب سے اہم کتاب 'ترقی پسند ادب' ہے اس کتاب سے ان کے اشتراکی نقطۂ نظر اور مارکسی فلسفے کی وابستگی کا اظہار ملتا ہے۔اس کتاب میں انھوں نے ترقی پسند تحریک کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ترقی پسند ادب ادارہ اشاعت اردو حیدرآباد سے 1945ء میں شائع ہوئی۔اس میں شامل مضامین ہیں۔(1) حقیقت نگاری (2) انقلابی قدریں (3) اردو ادب کی جدید تحریک (4) ترقی پسند شاعری (5) ترقی پسند افسانہ اور ناول (6) ترقی پسند ڈرامہ (7) ترقی پسند ظرافت (8) ترقی پسند تنقید (9) اردو میں ناول کے خدوخال۔ان کے مطابق اردو ادب میں حقیقت نگاری تو ترقی پسند تحریک سے قبل قائم ہے لیکن ترقی پسند تحریک نے حقیقت نگاری، اشتراکیت اور سماجی عوامل کو جس انداز میں پیش کیا وہ اس سے قبل کی تحریکات سے مختلف ہے۔اس تحریک نے حقیقت اور سماجی زندگی کو ادب کا مقصد بتایا۔ عزیز احمد نے اس کتاب کے ذریعہ ترقی پسند شاعری، ناول، افسانہ، ڈرامہ، طنز و مزاح اور تنقید کا مکمل جائزہ لیا۔اس سے ان کے ترقی پسند نظریے کی وضاحت ملتی ہے۔

ترقی پسندی اور اشتراکیت سے وابستگی کے سبب انھوں نے اپنی تنقید میں حقیقت نگاری پر بہت زور دیا۔لیکن حقیقت نگاری کے اس تصور کو وہ ترقی پسند تحریک کی ایجاد نہیں سمجھتے بلکہ ان کے خیال میں حقیقت نگاری کا مقصد ہمیشہ سے اردو ادب میں موجود تھا۔محض فرق یہ تھا کہ فنی خوبیوں کو اولیت حاصل ہونے کی وجہ سے یہ تصور واضح نہ تھا۔ان کے خیال میں تنقید کا کام یہ ہے کہ وہ سماجی اور تاریخی عوامل کا خیال کرے ساتھ میں فنی خوبیوں کو نظر انداز نہ کرے۔ان کے مطابق کوئی بھی ترقی پسند ناقد مکمل طور پر ترقی پسند تب تک نہیں ہوسکتا جب تک وہ شدت پسندی سے دور ہو کر اعتدال اور توازن کے ساتھ ادب کو پرکھے اور اس کی قدر و قیمت متعین کرے۔جو ادیب اور ناقد ترقی پسند ناقدین پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ صرف اشتراکی اور معاشی نقطۂ نظر

سے ادب پرکھتے ہیں وہ غلط ہیں اس بارے میں وہ لکھتے ہیں:۔

''ابتدائی مارکسی نظریے نے ادب کو معاشی توجیہہ کی حدوں میں ہرگز قید نہیں کیا۔ دست چپ کی تنقید معاشی عناصر کے علاوہ دوسری قوعتوں کے بھی قائل ہیں۔اینگز نے 1890ء میں لکھا تھا''میں اور مارکس ایک حد تک اس امر کے موردالزام ہیں کہ نوجوان مصنفین ادب کے معاشی پہلو کو واجبی حد سے زیادہ اہمیت دینے لگے ہیں''۔لینن نے بھی کہا کہ''حقیقت کے تمام پہلو کلیت سے ہی سچ ترتیب پاتا ہے۔''اس طرح یہ کہنا کہ اشترا کی تنقید تصوراتی، وجدانی یا دوسرے غیر معاشی پہلوؤں کے لیے کوئی گنجائش نہیں رکھتی بڑا غضب ہے۔اگر محض انقلابی موضوع ہی ادب کی عظمت کا واحد معیار ہوتا تو غالباً کمیونسٹ مینی فیسٹو ادب کا سب سے بڑا شاہکار سمجھا جاتا۔''

(ترقی پسند ادب۔عزیز احمد،صفحہ۔49)

ان باتوں سے واضح ہوتا ہے کہ ترقی پسند تنقید کی شدّت پسندی انھیں پسند نہ تھی اس لیے انھوں نے اپنی تنقید میں توازن قائم رکھا۔انھوں نے ترقی پسند تحریک کے اصول وضوابط اور سمت ورفتار کا جائزہ لیا۔انھیں اس تحریک سے مکمل طور پر ہمدردی ہے۔لیکن تحریک کو انھوں نے اپنے نظریہ کے تحت دیکھا۔اقبال کے بارے میں بعض ترقی پسندوں کا خیال تھا کہ ان کی شاعری میں رومانیت ہے اس لیے ترقی پسندی سے دور ہیں۔عزیز احمد نے اس نظریے کی مخالفت کی اور اقبال کی شاعری اور نظریہ کو ترقی پسند نظریہ کے قریب کہا۔وہ مارکسی فلسفہ اور اشترا کی نقطۂ نظر سے متاثر ضرور تھے لیکن انتہا پسندی سے ہمیشہ دور رہے۔ان کی تنقید میں سائنٹفک رجحان ملتا ہے۔جو کہ اردو تنقید میں ان کی قدر و قیمت بلند کرتا ہے۔ان کی تنقید ترقی پسندی کو ایک نئے رخ سے آشنا کراتی ہے۔ترقی پسند تنقید میں بدلاؤ لانے کی انھوں نے مکمل کوشش کی یہ صحیح ہے کہ ان کے تنقیدی کام بہت زیادہ نہیں ہیں لیکن جو بھی ہیں اس کی اہمیت بے حد ہے۔انھوں نے اشتراکیت کے علاوہ انسانیت اور فلاح پر بہت زور دیا اس لیے انسانی حقوق بھی ان کا موضوع رہے ہیں۔دراصل وہ ناول نگار ہیں اور سماج کی حقیقت سے مکمل طور پر واقف رہتے ہیں اس لیے تنقید میں ان کا نقطۂ نظر واضح طور پر حقیقت کے قریب ہوتا ہے۔ان کی تنقید نگاری کے بارے میں شارب رودلوی کا خیال ہے کہ:۔

''ان کا کہنا ہے کہ ادب زندگی کا پابند ہے وہ زندگی سے گریز کر ہی نہیں سکتا وہ انقلاب سے متاثر بھی ہوتا ہے اور کبھی کبھی انقلاب کا پیش رو بھی بن جاتا ہے۔عزیز احمد ایک غیر جانبدار ترقی پسند نقاد ہیں انھوں نے سائنسی اور معروضی انداز میں ترقی پسند نقطۂ نظر کا تجزیہ کیا ہے اور اس وقت کے ترقی پسند ادیبوں اور ان کی تخلیقات کی کوتاہیوں کو بھی ایمان داری کے ساتھ پیش کر دیا۔''

(ترقی پسند تحریک اور اردو تنقید۔تنقیدی مباحث۔شارب رودلوی،صفحہ۔45)

عزیز احمد کی تنقید میں دو رنگ واضح ہیں۔ابتدائی زمانے میں وہ اشترا کی نقطۂ نظر سے دور رہے بعد میں ان کی تنقید میں جو رنگ نمایاں ہے وہ خالص اشترا کی ہے اور مارکسی خیالات کی عکاسی کرتا ہے۔ویسے تو وہ ترقی پسند نظریے میں اعتدال وتوازن سے کام لیتے ہیں لیکن بعض جگہ وہ خود انتہا پسندی کے شکار ہو گئے۔بہر حال ان کی تنقید میں ترقی پسندی کا رنگ نمایاں ہیں۔عملی تنقید میں انھوں نے ادب اور فن کے تجزیے میں اشترا کی اور مارکسی جدلیت کو اولیت دی ہے۔ان کا خیال ہے کہ ادب اور فن کی عظمت تب ہی بلند ہو سکتی ہے جب موضوع اعلیٰ ہوں زندگی کی حقیقت سے وابستہ ہوں۔اردو تنقید میں ہمیشہ دو طرح کے رویہ نظر آتے ہیں تعمیری رویہ اور تخریبی رویہ۔عزیز احمد تعمیری اور تخریبی رویہ دونوں سے کام لیتے ہیں۔ترقی پسند تنقید کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:۔

''ترقی پسند تنقید کا اہم ترین فرض یہ ہے کہ وہ سختی سے جدید تحریک کے ہر پہلو کا جائزہ لے۔ہر رجعت پسند رجحان کو جو قدامت

پرستوں کے خوف سے اس انقلابی تحریک کے سائے میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ بیخ و بنیاد سے اکھاڑ پھینکے۔ اب اس سے کام نہیں چلے گا کہ ترقی پسند نقاد محض نظم، آزاد اور نظم عاری کی حمایت کو اپنا فرض سمجھیں۔ یا مارکسی تنقید کے بنیادی اصول عام فہم زبان میں سمجھاتے رہیں۔''

(ترقی پسند تنقید۔ ترقی پسند ادب۔ عزیز احمد، صفحہ۔167)

عزیز احمد کی کتابوں اور مضامین کے ذریعہ یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ اشتراکیت، مارکسی اصول اور سماجی حقیقت نگاری کو تنقید کے لیے سب سے اہم سمجھتے ہیں۔ اردو ادب میں ان کی اہمیت ناول نگار اور افسانہ نگار کے علاوہ ایک ناقد کی حیثیت سے ہمیشہ رہے گی۔

☆☆☆

ANWAR-E-TAHQEEQ

(Multiligual & Multidisciplinary Peer Reviewed Refereed Monthly Magezine from Qila-e-Golconda, Hyderabad, Deccan)

Volume:-2, Issue:- 2, FEBRUARY 2016

Price: Monthly:-50rs., Annual:- 500rs.

Supervision

Syed Adil Ahmad, Department of Archaeology, state museum, Hyderabad Telangana

Editor: **Syed Iliyas Ahmad Madni,**

Address:-

9-10-389, Neem Bowli, Masjid, Kathora House, Golconda Fort, Hyderabad, Telangana- 500 008

Mob:- 09966647580 Email:- anwaretahqeeq@gmail.com

Editorial Board

Dr. Shaid Naukhez Azmi, D/o,Persian,Manuu

Dr. Mohd. Aqeel, D/o, Persian, BHU

Dr. Sakina I Khan, HOD Persian, BU

Dr. Mohd. Qamar Alam, D/o, Persian, AMU

M. Tauseef Khan Kaker, D/o, Persian, AMU

Ahmad Naved Yasir Azlan Hyder

Editor, quaterly DABEER, Kakori, Lucknow

Arman Ahmad

Editor, quaterly Irfan, Chapra, Bihar

Atifa jamal

Editor Yearly Kokab-E-Naheed, Sandila

Sheikh Abdul Raheem, JIH, Hyderabad

Mutabbi Ali Khan, Daily Munsif, Hyderabad

Advisory Board

Prof. Masood Anwar Alavi, AMU, Aligarh

Prof. Umar Kamaluddin, LU, Lucknow

Prof. Syed Hasan Abbas, BHU, Varanasi

Prof. Azeez Bano, MANUU, Hyderabad

P. Anuradha Reddy, Intex, Telangana, Hyderabad

Dr. Zareena Perveen, Director of Archieves, Hyd.

Dr. S. M. Asghar Abidi, AMU, Aligarh

Ahmad Ali, Keeper Manuscript, Salarjung, Hyd.

Dr. S. Asmath Jahan, MANUU, Hyderabad

Dr. M. A. Naeem, Hyderabad

M.A. Ghaffar, caleographer, AIwan-e-Urdu, Hyd.

Kishore Jhunjhunwala, Expert of coins, Mumbai

Amarbeer Singh, Expert of coins, Hyderabad

INDEX

1. **Enrichment of Persian through Translation By Dr. Shaisata A. Khan** **3**

2. **Allama Iqbal and his philosophy of Khudi By Salina Begum Laskar** **11**

3. **Sufism in 18th Century in Indian Sub-Continent with Special Reference........................Sheikh Muhammad Ali Hazin By Mohammad Anash** **23**

4. **B.S.P: Emergence and Role in Politics by Mohammad Amir** **28**

5. **वैजलभूपति कृत 'प्रबोधचन्द्रिका' में नीति एवं व्याकरण विद्या का महत्त्व डॉ० जफर इतेखार** **34**

Enrichment of Persian through Translation

Dr. Shaisata A. Khan, Ex. Head, Department of Persian, University of Mumbai, Mumbai.

Persian Language found its way to the Indian Sub-Continent long ago, from the time of Ghazanavids however Literary contact between India and Iran was gradually strengthened. The Indians convicted greater interest in Persian Language and Literature and by the Mughal Period there were so many scholars, poets and writers of Persian that India was regarded as a land of Persian Language.

Indo Persian Literature is one of the most treasured gifts in the rich store house of Indian Culture. It was the creative expression of the cultural synthesis achieved during the medieval period of Indian history and marks the beginning of a new Era in the history of Indian culture. Throughout the period of Indian history Persian served not only as a state language, but also as the common medium of communication among the intelligentsia all over the country. In classical Persian Literature three distinct styles have been recognized by Iranian scholars, and the Indian style Sabk-i-Hindi is one of them. Amir Khusrau, Tuti-e-Hind (The parrot of India) is the founder of this style and there is no doubt he was the top ranking Persian poet of India. Whose greatness has been acknowledged by scholars of Persian in India and abroad.

The Persian Language, during the Muslim ascendancy in India all over the country not only in Mughal territory but also in the virtual independent states of Deccan, Bengal and Oudh, Persian was used in the government offices in which a large number of employees were the natives of India. Even the Maratha in the times of Chatrapati Shivaji, which had modeled whole administration upon the Mughal empire and in the Sikh state in the days of Maharaja Ranjeet Singh, Persian was continued along with the order regional languages.

During the regime of Sultan Mehmood of Ghazni that Nanda, Raja of Kalinjar, Composed few verses from Sanskrit into Persian in 1023 A.D. According to Tarikh-i-Farishteh, the Raja who had confined himself in a fort for fear of Sultan Mehmood, surrendered and made a present of the Sanskrit verses in Persian to the King, who appreciated and rewarded him several

forts.

While in the early century Sultan Jalaluddin Khalji ascended the throne of Delhi and showed interest in Sanskrit lore and scholarship. Sultan Feerozshah Tughlaque. Shams-iSiraj Afif under the title of Tarjuman-i-Barahi. A Sanskrit treatise an Indian Music called Sangita Darpana was translated into Persian and called Ghuntatu-i-Munyah.

In the reign of Sultan Sikandar Lodi in 1512 a work on Indian medicine "Agada Maha Vaidyaka" was translated under the supervision of his prime minister Miyan Bhua Khawas Khan and named Tibb-i-Sikandari. This work contains a detailed account of therapeutics, the structure of the human body, diagnosis and treatment of diseases and Indian Medicines. It is not only translation but based on the works of Carak, Susrut, Karan, Bhoj, Cintaman, Cakravat, Kitar etc.

King of Kashmir and Deccan took active part to Indian Learning and culture. Sultan Mahmud Begera, a work on the cure of horses was translated under the name of Khail Nameh by Zainul-Abedin Karbala-i-Alias Hashmi.

The patron of "Jonaraja" who continued the compiling and editing of the great Sanskrit historical work Raj Tarangini, along with a number of Hindu Scholars, including the Physician Sri Bhatia.

The countries to the west of India came in contact with Indian life from very early times. In India itself Sanskrit and its allied literature were maintained in continuous records from very ancient times. Outside India it is the Iranians who were supposed to be the first to take interest in this Literature.

Two famous collection of stories, namely, the Panchtantra of Vishnusarma, the book of the beast-fables which was known in Iran in the Sixth century under the Sassanian dynasty and the book of the legend of the Buddha and Bodhisattva, known under the names of Barlaam and Joasaphat, Spread through Iran and Syria to the whole of the Islamic countries and there from the other part of Europe. Abu Salih Shuaib translated ancient Indian works from Sanskrit.

Probably the Maha Bharata of Vyas which was performed into Persian by Abu Hasan Ali Jalili in 1026.

At the time of Sultan Behram Shah Abdul Ma'ala Mustawfi, who was the chief secretary

of the Darul-Insha, during the time of Sultan Ibrahim Ibn Masu'd, the twentieth Ghaznavid's monarch, translated into Persian. The Arabic version of Ibnul Muqaffa's Kalileh-o-Dimneh which was a version of the Sanskrit Panchtantra, this was translated into Persian prose interspersed with poetry and Arabic quotations, by Mulla Husain Wa'iz Kashifi under the title of Anwar-e-Suhaili-Abulfaza at the instance of Emperor Akbar simplified Kahsifi's Anwar-e-Suhaili and called it Ayar-i-Danish.

Kingdoms of Kashmir and Deccan showed an enthusiasm and displayed and active patronage to Indian Learning and Culture. Among the works translated into Persian was Kalhari's Raj Tarangini. This is the well known history of Kashmir and was known in Persian as Bahrul-Asmar. Haider Malik bin Hasan Malik brought out his Tarikh-i-Kashmir on the basis of the same work. There is another book also under the name of Baharsitan-i-Shahi from the same source. Narayana Kaul also rendered into Persian the original work under the title of Tarikh-i-Kashmir. The Mahabharata was also translated into Persian during the reign of Sultan Mahmud Shah Bahmani, a medical work in Sanskrit named Astanga-Hrdaya of Vagabhatta was translated and was named Tibb-i-Mahmud Shahi. While at the instance of Sultan Mahmud Begara, a work on the cure of horses was rendered into Persian but Zainul-Abedin Karbalai known as Hashimi, under the name of Khail Nameh.

It was in the reign of Sultan Sikandar Ludi that a work on Indian Medicine, Agada-Mahavaidyaka was translated into Persian under the supervision of Miyan Bhuawat Khan and was termed Tibb-i-Sikandari. This work was decidedly an improvement on all other previous Persian translations on medicine and contains a detailed account of theraoeutics, the structure of the human body, and the diagnosis and treatment of diseases.

During the Muslim rule in India most of the Sanskrit works were rendered into Persian with the help of Sanskrit Scholars and pundits. Those works included, among other, the Mahabharata, the Indian epic, the Ramayana, the story of Rama and his wife Sita, the Atharva Veda, the book of magical spells, the Upnishads, a series of philosophical treatises, the Bhagvadgita, the the philosophical didactic poem, the Yogvishishta, the moral and religious dialogue between the two rishis Vashisht and Ramchandra, the Panchtantra, the book of

beast-fables, the Rajtarangini the dynastic history of Kashmir, and the Simha-Sanadvatrimsat, the thirty two tales of the Lion-Throne, Besides, other works of importance such as those on medicine, music, astronomy, mathematics, and mythological stories and heroic legends as well as Puranic works, were rendered into Persian from about the end of the eight century to the beginning of the thirteenth century of Hijri era.

During the reign of Emperor Akber a hitherto unprecedented patronage was extended to Indian learning and translation of important Sanskrit works, particularly on Indian philosophy and various other sciences. According to Abul Faza, Akbar's library consisted of a large and varied collection of Sanskrit, Persian, Arabic and Greek works. The learned scholars who were engaged to translate the Sanskrit works into Persian were Abul Fazal. Prime Minister of Akbar. Faizi, the poet laureate, Abdul Qadir Badayini, Famous historian, Naqib Khan, the outstanding theologian, a noted philosopher Sultan Thanesari, a great thinker Mulla Shiri, who were all assisted in their work of translation by an equality large number of Sanskrit scholars and pundits well versed in Indian philosophy and sciences. These translations along with Devi Brahmin, the renowned scholar and philosopher and other pundits were housed in the library of Fatehpur Sikri.

The spirit under lying the translation into Persian was none other than that described by Abul Fazal in his preface to Razm-i-Nameh, the Persian version of Mahabharata.

"Having observed the sanatical hatred between the Hindus and the Muslims and being convinced that it arose only from mutual ignorance, the enlightened monarch wished to dispel the same by rendering the books of the former accessible to the latter."

The spirit of inquiry initiated by Emperor Akber proved a preliminary to the gradual evolution of Hindu-Muslim thought which not only enriched Indo-Persian Literature but also aroused great interest in Indian philosophy and sciences.

The Ramayana of Valmiki was begun by Abdul Qadir Badayuni in 992 of the hijri era and was completed after a duration of four years. Besides this, there are four other abridge versions of Ramayana. The first abridged version was begun by Girdhardas Kayasth and was dedicated to Emperor Jahangir, the second is a poetical translation under the title of Ram-o-Sita by sheikh Saadullah, known as Maseeh Panipati. It was also completed in the reign of Emperor

Jahangir the third is by Candaraman Kayasth during the regn of Aurangzeb Alamgir, completed in 1107 era. The fourth again poetical version by an anonymous writer.

During the reign of Akber eighteen pravas of the Mahabharata was translated under the title of Razm-i-Nameh. Faizi improved upon the prose translation of Mahabharat by adding the translation of two pravas to Razm-i-Namwh. The Bhagvadgita was translated under the name of Gita and Bhaskarachariyas's Lilavati, a work of arithmetic and geometry. Soma Deva's Katha Sarit Sagar a collection of stories were rendered into Persian by Faizi. The story of Raja Nal and Damyanti and anecdote from the Mahabharata termed Nalopakhyana, was rendered into Masnavi by Faizi and named Nal Daman.

The most original work in the Shariqul-Marifat a treatise on vedantik philosophy, based on the Yogavashishta and the Bhagavata Purana the translation of Atharveda, a work an rituals, magic and popular practices was first undertaken by Abdul Qadir Badayuni with the help of Bhawan Khan (A Brahmin convert) and later on by Haji Ibrahim Sarhindi and was termed Atharban. At the order of Akber Abdul Qadir Badayuni rendered the Simhasanad Vatrimsat into Persian and named it Khirad Afza (982 Hijri). This work consists of thirty two stories of Lion-Throne. Another version in known as Shahnamah by Chaturbhujadas Miharchand. During the regime of Jahangir it was again rendered into Persian under the title of Qissa-i-Bikramajit. Gul Afghan is another version of the same. Mulla Siri in Akber's reign translated Vyasa's Harivamsa, the life of Krishna, and called Hari-Bans.

During the regime of Shahjehan, prince Dara Shikoh, who was fond of Indian philosophy and religion, made invaluable additions to Indian thoughts. His translation include the Upanishads under the title of Sirr-i-Akbar. The translation of Bhagvadgita was done by Prince Dara Shikoh. The Yogavashishta was rendered into Persian at his instance and was known as Jug-Bashisht. His important work is Majma-ul-Bahrain, a comparative study of Hinduism and Islam. It may be noted here that the Sanskrit work, Samudra Sangama written in 1708 is supposed to be the translation of Majma-ul-bahrain. The genuine dhurupads of the famous musician Bhakshawa of Gawaliar, were collected in a book and called Ragaha-i-Hindi, Faquiru-i-lah translated into Persian. The explanation of Indian musical notes and melodies from the original Sanskrit work

named raga darpan of Raga Vibodha.

In the days of Aurangzeb Alamgir a Sanskrit work on Indian music and dance called Parijataka was translated and termed tarjumah-i-Parijataka by Mirza Roshan Damir Amrtakunda a Sanskrit work on the religious and philosophical doctrines of Hindus under the title of Bahrul Hayat Mufti rajuddin translated Narayana Pandit's Hito Padesh collection of fables,, which was named Muffarihul Qulub. A Persian translation of Sanskrit work on Islamic theology and philosophy was made by Sheikh Kamal Muhammad under the title of Khub Tarang. Bhaskaracharya's Bijaganit a treatise on Algebra and Menstruation was an Mukamal Khan Gujrati translated Nikhantha's Tajika, a work on astronomy, under the name of tajik Sankara Bhasya a commentary on Badrayan's Brahmasutra by Sankara, was rendered into Persian by Laxhmi Narayana under the name of Haqiaq-ul-Marifat and Ramasvamedha, the life of Rama, was translated into Persian by Makhanlal Zafar under the name of Jahan-i-Zafar. A Ram Narayana Hari Narayana translated Titra mahatmiya a treatise on the holy places of Hindus O called it Makhzanul Irfan.

Abul Qasem Firdausi versified Shahnama, the national epic of Iran. A number of references in Shahnama to Indian history and culture speak of the fact that Iranians at that point of time were well-conversant with a number of aspects of Indian life. Apart from eulogizing the Indian sword and intellect, he gives a vivid account of Shatranj, a popular Indian game which was taken to Persian during the Sassanid period. Surprisingly, the account in this regard provided by Firdausi in his Shahnama is more minute and detailed than what is available in ancient Indian sources. Contribution of India on the whole, to the development of Persian poetry is vital and distinctive, poetic works of Indian born poets like Khusraw, Faizi, Chandra Bhan Brahman, Bedil, Ghalib and Iqbal and those who migrating from Iran like Naziri, Zahuri, Ghazali, Urfi, Talib, Kalim and Saib perfected their art in the poetical climate of Indian courts were recognized all over Persia and Central Asia. Persian poetry produced in India is a truer index of the social and cultural contact between Hindus and Muslims. Large numbers of Persian poets and writers who lived in India during the Muslim rule produced works of real beauty and left a deep impress upon literature in its Indian environment.

Abu Raihan Al Biruni, an outstanding scholar of Indian culture, and Amir Khusraw Dehlavi an allo round genious of age took the Indian learning and science, and transferred Indian lore into Persian in particular in order to understand Indian philosophy and culture. Sultan Zainul Abedin of Kashmir and Sultan Hussain Shah of Bengal, Emperor Akbar and Prince Dara Shikoh were promoted to reproduced Indian learning into Persian.

The Puranic literature was also translated and among others it included the Siva-Purana, a work on Siva and Saivism, the Bhagvata Puran, a treatise on Bhakti, the Maha-Vishnu-Purana, work on Vishnu, and the Skanda-Purana, a work on Siva.

The visits of Tagore, Nehru, Radhakrishnan and Azad to Iran have inspired Iranians to take active interest in Indian learning. Ali Asghar Hekmat's interest in India is directly responsible for his works on Indian history and culture. He has also translated Shakuntala of Kalidasa into Persian. Jalali Naini's publication of Dara Shikoh's Persian translation of the Upanishads has new and fresh chapter on Indo-Persian cultural relations. Mehmud Tafadduli's translations of the works of Pandit Nehru, Masud Barzin's of the autobiography of Mahatama Gandhi and Girdharilal Tikku's of the works of Dr. Tagore have acquainted Iranians with the cultural heritage of our country and with the trends of modern thought in India.

Bibliography

1. Post Revolution Persian Verse, Munibur Rahman, Aligarh, 1958
2. Development of Persian Historiography in India, Ed. by Prof. S. M. Waseem, New Delhi, 2003
3. A History of Persia, Vol. II by Percy Sykes, Third Edition, London, 1969
4. Indo-Persian Literature by Prof. S. A. H. Abidi, Compiled by S. B. F. Husaini, Delhi, 2003
5. Tareekh-e Adabiyaat-e Iran by Reza Zadeh Shafaq Lahore, 2011
6. Farsi Adab Ki Mukhtasar Tareen Tareekh by Dr. Md. Riyaz & Dr. Siddiq Shibli, Delhi, 2011
7. Mughal Shahinshah Akbar Ke Ahd Men Farsi Tarikh Nawisi by Dr. Khwaja Ghulamus

Syedain, Nagpur, 2009

8. A Literary History of Persia, Vol - III & IV, Prof. E. G. Browne, New Delhi, Reprinted 2003

9. Ethics in Persian Poetry, Ghulam Abbas Dalal, 1995

10. Fikr-o-Nazar, Prof. Nizamuddin Gorekar, 2001

Allama Iqbal and his philosophy of Khudi

Salina Begum Laskar, Guest Faculty, Department of Persian, Gauhati University

Introduction:

Many of us know Allama Iqbal as the writer of our famous patriotic poem " SARE JAHA SE ACHA HNDUSTA HAMARA- HAM BOLBOL-E- HAI ISKI YAH GOLSETAN HAMARA" but very few of us acknowledge him as a last great Persian poet, a reformist, a philosopher, a thinker, a preacher, a politician and, without doubt a greatest Muslim thinker. He was born and brought up in the 20th century when the sun of the British Empire never set and India was very much part of that Empire. Western imperialism was imposed on the east where our education, economy, politics and society were overwhelmed by new ideology and beliefs. The society was overburden with materialism as result spiritualism had become a myth. In this environment the Iqbal foster his philosophy of Khudi. He in the history of world literature is the greatest poet of humanism. He has mentioned humanity in his poetry with so much love, care and affection, example of which never found in the history. He was great interpreter of humanism. Iqbal believed that to bring revolution in outer world it is necessary to transform inner world. At outset one has to be awakened then only there will be change in the world. In this small article an attempt has been made to highlight the philosophy of Khudi (roughly translated as SELF) as expounded by Allama Iqba.

Glimpse of his life:

Muhammad Iqbal was born in Friday, November 9, 1877, at Sialkot in the Punjab, and died at the peak of his fame and glory on April 21st 1938 in Lahore. Iqbal's ancestors hailed from Kashmir and were Brahmins of the Sapru-sub-caste. Iqbal began his early education in Sialkot and passed his Matriculation Examination with distinction, in 1893, from the Scottish mission school of the same town. Iqbal came to Lahore in 1895 for his higher studies and came under the influence of a renowned teacher, Sir Thomas Arnold, who inspired him to visit Europe in 1905. During his stay in Europe Iqbal studied Philosophy at Cambridge under the tutorship of J.M.E.

MC Taggart and James Ward. After studying in Cambridge, he went to Germany and began to research in Persian Metaphysics in Munich University from where he received his Ph. D. in 1908 for his thesis entitled "The Development of Metaphysics in Persian". 1

His Works:

Persian:

1. Asrar-e-Khudi published in 1915
2. Rumuz-e-Bekhudi published in 1918
3. The Zabur-e-Ajam published in 1927
4. Javed Nama published in 1932
5. Pas Chih Bayad Kard ay Aqwam-i-Sharq published in 1936.
6. Armagan-e- Hejaz published in 1938 after 6 months of his death

Urdu:

1. Bang-e-Dara published in 1924.
2. Baal-e-Jibreel published in 1935
3. Zarb -e- Kaleem published in 1936

English:

1. The Development of Metaphysics in Persia published in 1908
2. The Reconstruction of Religious Thought in Islam published in 1930

The source of his philosophy:

Allama Iqbal developed his own philosophy after amalgamating the west with the east. He discussed the fundamental principles of Islam in the light of modern thought and scientific knowledge and made a searching analysis of its basis. Undoubtedly he accepted divergent views expounded by the western philosophers and thinkers but the soul of his philosophy lies in the Islam. He made a serious attempt at seizing with the problems of modern western philosophy within an Islamic context. He, in this endeavour, was inspired by western thinkers like Nietzsche and Muslim spiritual teachers like Mohammad Ibn al Arabi and Maulana Jalaluddin Rumi. Mohammad Ibn Arabi (1165-1240) was a great Aref (Gnostic) and expounder of Wahdat Alwojud. His famous statement, "It is He who is revealed in every face, sought in every sign,

gazed upon by every eye, worshipped in every object of worship, and pursued in the unseen and the visible. Not a single one of His creatures can fail to find Him in its primordial and original nature" 2 helped him a lot in generating the philosophy of Khudi. Iqbal considered Maulana Jalaluddin Rumi as his spiritual guide. He was greatly influenced by the ideology of his spiritual guide and tried his best to implement into his life, poetry and philosophy. Maulana was a Persian mystic and poet who was born in 1207 and died in 1273. Maulana introduces himself in the following words:

"I am neither Christian nor Jew
Neither Persian nor Muslim.
I am from neither the East nor the West
Neither from land, nor from water.
Mu place is without place,
My trace is what is, without trace.
I put aside duality.
I have seen two words in one,
He is the first, He is the last,
He is within, He is without".3

Main theme of his philosophy

Love of God and Khudi are the main theme of his philosophy around which all his poetry revolves. He gave expression to a humanitarian message with a universal appeal, uncontrolled by temporal limit. His message of passionate love, intense devotion, complete humility, universal brotherhood and humanitarian values holds true for all times and all peoples. It has both eternal and universal appeal and relevance. He had the courage and the vision to question and reinterpret existing social norms and gain acceptance and respect among his contemporaries and succeeding generations. His message, in many ways reflects the broad principles of tolerance, peace and brotherhood preached by Islam. He introduces his notion of Khudi to in calculate revolutionary spirits into the heart and mind of the Muslim Umma (community).

What is Khudi (Self)?

We as a human being have shown our great interest since very beginning to know everything about the self. Almost in every age and in every country great scholars have given attention to solve the questions relating to the Self. What is self? Can its existence be proved? The philosophy of Iqbal circles around this basic problem and with his philosophical attitude he tries to solve them also. A powerful historical motive instigated him to think like this. The India, Asia and the Africa of 20th century were under imperialistic control. The entire Asia has deviated away from the main goal and was running on the path of devastation by following the west blindly. In fact the entire humanity was victim of this damage because western ideology despite many materialistic progresses has pushed the world on the verge of downfall. That is why Iqbal got confused with the philosophy of the west and concentrated to the east. Iqbal has used khudi in special sense and meaning. In fact for Iqbal khudi is a very simple natural phenomenon. In his opinion, to recognize ourselves, to develop our personality and character and purification of the soul is khudi. Khudi is all omnipresent like the Atma of Advaita philosophy which contains the entire Cosmos within itself. Iqbal says:

"The self resides in you, just as the infinite sky with all its vastness is contained in the pupil of the eye". 4

In his famous book- Asrar-e-Khudi (secrets of the Self), Iqbal has explained his philosophy of Khudi. Iqbal's use of the term Khudi is synonymous with the word "Rooh"(Atma) mentioned in the Quran. 5 "Rooh" is that divine spark which is present in every human being, and was present in Adam when he was created by God. Hence God ordered to the angels, "Prostrate before Adam"; so they prostrated, except for Iblees. He refused and was arrogant and became of the disbelievers. 6 Iqbal believed that man is deputy of God on earth. As the Holy Quran declares, "when your Lord said to the angels, "Indeed, I will create my vicegerent on the earth " They said, "Will You place upon it one who causes corruption therein and sheds blood, while we declare Your praise and sanctify You?" Allah said, "Indeed, I know that which you do not know." 7 Iqbal's philosophy of khudi is ultimately the foundation of his concept of God. His view of God is same as mentioned in the holy Quran, "Say: God is one. He is the Eternal, Absolute. He begetteth not, nor is He begotten" 8

He says:

"This breath is like a sword.

The self is like the edge of the sword.

The self is the secret mystery of life

The self is the awakening of the whole creation

The first day of the creation is behind it and endless time is before it

It has no limits behind or beyond".9

Importance of Khudi in our Life

Iqbal argues that only by being convinced of the importance of Khudi and by leading a life of self affirmation, self-expression and self development, a nation can rise. He therefore, writes, "The moral and religious ideal of man is not self-negation, but self-affirmation".10 According to Iqbal, man is self-contained physically as well as spiritually, but he is not yet a complete and perfect individual. The greater his distance from God the lesser is his individuality. He who goes nearest to God is a complete person. Not that he is finally absorbed in God. The true individual cannot be lost in the world: it is the world that is lost in him. The unbeliever is one who is lost in the Universe; A believer is one in whom the Universe is lost. He held that man should do everything possible to develop his self and bring it to perfection. 11

Place of man

Iqbal decisively considers that higher than Heaven is the place of man. Man is the superior of the creatures. God wanted to be recognized so He created man. This Universe and whatever is in it all are created by God for man. Therefore, Iqbal in a very clear and loud voice emphasizes on maintaining identity and individuality of man. He says:

"Will there remain any luster in the sun,

If it is fed up with its rays"? 12

He gives stress again and again that man can redeem his honor only by maintaining dignity of Khudi. He thinks that man should shine with his own light, not with the borrowed one. He can make himself eternal only by strengthening his self. He addresses man and says, 'do you know what is secret of life? And answers, "life is liberating oneself from circumambulation of

others and regarding himself as the house of God" 13 The man himself is the architect of his fate. He can make either paradise or hell for himself, since the power of choice rests with him. While establishing supremacy of man he argues with God:

"You created the night my master, and I lighted the lamp

From the poison I extracted the antidote and carved a mirror from the stone

Tell me sincerely, oh my Creator! Who is greater you or me?" 14

Objectives of the Khudi

This wide and high ideology of khudi has diverse themes and contained many topics like Khudi and Khoda, Ishq and Love, compulsion and destiny, slavery and freedom , life and death, this world and hereafter world ctc. Khudi is not only a philosophical or sufistic ideology it has great objectives for which it came into action and proves it identity. A strong desire is very much necessary to achieve anything. It instigates to us to acquire things. Effort is created out of need. Our life is indebted to intention. Knowledge, wisdom and action all are gift of desire and have one purpose how to protect and develop life. Iqbal says:

"Life is preserved by purpose:

Because of the goal its caravan-bell tinkles.

Life is hidden in seeking

Its origin is concealed in desire

Keep desire alive in your heart

So that your little dust cannot become a tomb.

Desire is the soul of this colorful world

The nature of everything is loyal to desire.

The heart dances in breast due to desire

And due to its blaze the heart becomes as bright as mirror.

It gives power of rise to the earth.

We are alive due to creation of ideas

We are shining due to the sunbeams of desire". 15

Khudi and Ishq:

Transparency or purity of heart is one of the subjects widely dealt with by Iqbal. The place of God, as regarded by Iqbal, is the human heart. It is love that purifies the heart, cleans it up, clears it from wordily rubbish, and makes that heart a worthy place for God. According to Iqbal the salvation of the inhabitants of this earth lies in love. Khudi is strengthened by Ishq (love). Khudi is radiant point. It is made more lasting, more living, more burning and more glowing by love. The beginning of the journey to the self is love and the end is Beauty. Iqbal says:

"The luminous point whose name is the self
Is the life-spark beneath our dust?
Love fears neither sword nor dagger,
Love is not born of water and air and earth.
Love makes peace and war in the world,
Love is the fountain of life,
Love is the flashing sword of death.
The hardest rock are shivered by love 'glance,
Love of God at last becomes wholly God.
You learn to love and seek a beloved" 16

Negation of life is death to the living.

Iqbal is not satisfied with this world. He wants to create his own world. He is not even ready to gets Paradise if he gets free. In short Iqbal is interpreter of life and lover of beauty. He is torch bearer of action and emotion. He is disgusted with the platonic and non Arab Sufism. This kind of Sufism suggests to be drowned in the sea of spirituality by considering this world as an illusion. It teaches us negative characters like asceticism, austerity, patience and contentment on the palace of affirmative characters like courage, bravery, determination and will power. Meanwhile the Islamic Sufism is a kind of positive and optimistic Sufism that does not allow monastic life at all. There is a saying of Prophet Mohammad, "this world is a kind of agricultural field for the next world" 17. This world from Islamic point of view is not an illusion rather it is a reality and work of place for the afterlife. Poetry of Iqbal nullifies negative mysticism and in calculates positive mysticism in the mind of the readers. Iqbal Says:

"In every atom shines the might of the Self
As much as the life of the Universe
Comes from the power of the self,
Life is in proportion to this power.
When a drop of water gets the self's lesson by heart
It makes its worthless existence a pearl.
When the mountain loses its self, it turns into sands
And complains that the sea surges over it
Because the earth is firmly based on itself
The captive moon goes round it perpetually,
The being of the sun is stronger than that of the earth
Therefore is the earth fascinated by the sun's eye." 18

Stages of Khudi

Iqbal has prescribed three stages to train our Self:

The first stage is Atayat (submission)

Be worshipping God and bringing discipline in our day today life we can develop high quality of khudi . Each and every particle of this world including man and animal follow certain rules and regulations. All these are bound together by natural laws which allow them to exist with an integrated coherence. There are systems to regulate our conduct and behaviour. So, God sent legislation to make man's life the best on this earth so that he will be happy in this life and in the Hereafter. We see the daily rising and setting of the sun, the moon appears and shines according to phases, the seasons change on a yearly basis and the days and nights occur according to their length fixed in every season. A human in this world is like a student in a school. He has to learn lessons of regularity, punctuality, mindfulness and attentiveness from his teacher. Discipline makes our lives easy and enables us to realise our goals. Overall, society becomes caring and law-abiding.

The Second Stage is Zabt-e-Nafs (restraint of Self)

The self is vicious one has to bridle it. One who has full control over his self then he is

free from all kinds of greed and fear. He is only afraid of God. Self restrain is that pure state of the human heart that controls man's deeds and creates harmony between the internal forces and external acts of man. It connects man with Allah and lifts up the curtains between the material world and the super natural. . We have to regulate what we consume. We have to regulate our speech. We have to constantly apply control over our thoughts and feelings. We have to control our anger, our jealousy; any feelings of pride or arrogance. We constantly have to check our actions against our intentions. " Taqwa (piety) is the prerequisite for a person who wants to live his life by certain principles, whether they are religious or not, and he is to have a clear direction in order to move towards a specific goal. In doing so, he is to protect himself against transitional desires inconsistent with his goals and principles." 19

Thus, taqwa in a broader sense is a requirement for everyone who wants to be a true human being, live under control of reason, and follow certain principles.

The third is Vicegerency of God:

This is the last stage and final point of khudi. Iqbal firmly believed that God is to be sought not by begging but on the strength of will. Once found one is not to annihilate oneself in God but rather to absorb God within oneself; that is, "create in you the attributes of God" as much as one possibly can - a possibility to which there are no limits. If the human ego is able to do this successfully, it will then become worthy of the vicegerency of God - that is, khudi will have reached perfection in man. 20

Conclusion:

Iqbal is poet of life and existence. He deeply believed in humanism and tried his best to raise position of man by inculcating spirit of God into him. He is flag bearer of action and emotion. He is interpreter of natural beauty. He is heavily influenced by philosophy of Sufism. He inspired man to come out from the earthy world and to be drowned into spiritualism by maintaining his Khudi. The Khudi is both the starting point and the foundational feature of his thought. The self is fundamental to Iqbal. It is the most important and dominant area of his philosophy. Iqbal himself had passed through various stages of developing his own self. Whatever he wrote about the self was from the knowledge achieved through his own experience and his

dialectic was not merely a literary work or philosophical theory. Iqbal gives central position to man in the universe. Man is co-worker with God. He advises man raised your Self so high that before every verdict God Himself may ask you: what is your desire. From humanist point of view it is the best tribute paid to man as he has been made master of his own destiny.

Notes

1. Iqbal: Poet-philosopher of Pakistan , p.3
2. The Reconstruction of Religious Thought in Islam,p.62
3. Ghazliyate Shams Tabrezi, p.45
4. Bange Dara, Iqbal, p.18
5. http://www.allamaiqbal.com/person/biography/biotxtread.html. Retrieved 2013-12-19.
6. Holy Quran, Surat Albaqra, Ayat number 34
7. Holy Quran, Surat Albaqra, Ayat number 31
8. Holy Quran, Surat al Ikhlas, Ayat number 1-3
9. Saqinama-iqbal,p.43
10. The Secrets of the Self, p.xviii
11. The Secrets of the Self, p.XIX.
12. Bal-e-Jibril, Iqbal, p. 36
13. The Reconstruction of Religious Thought in Islam, p. 53
14. Asrar-e-khudi, Iqbal, p.23
15. The Secrets of the Self, p.25-26
16. The Secrets of the Self, p.28-29
17. (http://www.muslimphilosophy.com/iqbal/) 28th November 4.30pm
18. The Secrets of the Self, p.32
19. Iqbal as Thinker by Eminent Scholars, p.107
20. http://www.allamaiqbal.com dated 5th December 2013

References:

1. Ahmad, Aziz, (1950) Iqbal and the Recent Exposition of Islamic Political Thought. Lahore : Sheikh Muhammad Ashraf

2. Ahmad, Aziz. (1955) Iqbal-Nai Tashkil. Lucknow : Maktab-e-Urdu

3. Akbar, Ali Sheikh. (1932) Iqbal: His Poetry and Message., Lahore: Mir Muhammad Nawab Din

4. Ali, Sheikh Akbar. (1979) Iqbal-ki Shairi aur Uska Paigham. New Delhi: Aitiqad Publishing House

5. Ansari, A.A. (1978) Iqbal: Essays and Studies (edt) New Delhi: Galib Academy

6. Ashraf, M.(1944) Iqbal as a Thinker. Lahore: Sheikh Muhammad Ashraf

7. Ashraf, Ehsan Dr. (2003) A Critical Exposition of Iqbal's Philosophy. New Delhi : Adam Publisher & Distributors

8. Ashraf , Sheikh Mohammad. (1973) Iqbal as Thinker by Eminent Scholars. Lahore:

9. Azmi, Abdul Latif. (1978) Iqbal Dana-e-Raz. New Delhi: Maktab-e-Jamia

10. Bilgrami, H.H (1954) Glimpses of Iqbal's Mind and Thought. Lahore: Orietalia

11. Iqbal, Muhammad. (2006) The Reconstruction of Religious Thought in Islam. New delhi: Kitab Bhavan

12. Iqbal, Muhammad.(2005) Kulliyate Iqbal. New delhi: Kitab Bhavan

13. Iqbal, Muhammad. (1955) Bal-e-Jibril., Lahore: Taj Company

14. Kazmi,Sayed Latif Hussain(1997) Philosophy of Iqbal. New Delhi: A.P.H. Publishing Corporation, Darya Ganj

15. Malik, Hafeez (1971), Iqbal: Poet-philosopher of Pakistan, Columbia University Press.

16. Moghni, Abdul (2011), Iqbal ka Nazarye Khudi, Maktaba Jamiya, New Delhi

17. Mosleh, Abu Muhammad. (1986) Quran aur Iqbal., Hyderabad: Alketab Publisher

18. Nicholson, R. N. (1944) The Secrets of the Self, Lahore

19. Rumi, Jalaluddin. (1384) Masnavi Manawi, Tehran: Intesharat-e- pezoheshi

20. Schimmel, Annemarie. (1989) Gabriel' Wing. Lahore: Iqbal Academy

21. Sorush, Ahmad (1373 A.H) Kulliyate Ashyar-e- Farsi Maulana Iqbal Lahuri, Tehran :

Ketabkhane Senai

1. http://www.allamaiqbal.com/person/biography/biotxtread.html. Retrieved 2013-12-19.
2. (http://www.muslimphilosophy.com/iqbal/) Retrieved 28th November 2013

Sufism in 18th Century in Indian Sub-Continent with Special Reference to Relevance and Contribution of Sheikh Muhammad Ali Hazin

Mohammad Anash, C.A.S, Dept. of History, Aligarh Muslim University

EARLY LIFE OF MUHAMMAD SHEIKH ALI HAZIN:

Sheikh Muhammad Ali Hazin was a great learned scholar and sufi saint of the eighteenth century, born on Monday, the 27th Rabiul Akhir, 1103 A.H at Isfahan . His father's name was Abu Talib, Who was a great scholar, died in 1127 A.H./1715 at the age of 69. Hazin had written an elegy on the death of his father. He had three brothers and was the eldest of them all. Out of the three, one died in his infancy and the two died in their youth. Hazin does not mention the names of his brothers in the Tazkirat-ul-Ahwal. Hazin was possessed of great self-respect. His proud and supersensitive nature did not allow him get the patronage of kings and nobles. Hazin was high-minded, sweet-tempered, of a delicate temperament, kind hearted and constantly lamenting. He talked low tone and used to introduce elegance and eloquence in his explanations.

At the age of four in 1107 A. H., a teacher was appointed to instruct Hazin by his father . He began his education under the Mulla Shah Muhammad of Shiraz who came to Isfahan. After the commencement of two years that is by the year 1109 A. H., Hazin was capable of plain reading and writing. He studied many Irani books both in prose and verse; and being put to learn grammer and etymology and jurisprudence, he soon acquired them. He was then taught logic. At the age of eight, in the year 1111 A. H., his father appointd Maulana Malik Husain Qari to improve his Qirat. He studied under him for two years upto 1113 A. H. At the age of ten Hazin's father himself instructed him and made him capable of reading a lot of books under him like Jami's Sharah-i-Kafiya, Nizam's Sharah-i-Shafiva, Sharah-i-Shamsiya etc. Hazin visited Lahijan in 1113 A. H., at the age of ten and remained there for one year.

For a period of about three years, Hazin was instructed by the aforesaid Shaikh Khalil Ullah of Taliqan from whom he derived his takhallus "Hazin". He learned the Bible and had the interpretation of it written by him, and informed himself of the truth of all that they maintain.

Hazin read the Tablat-i-Shifa , Ilahiyat-i- Sharah-ul-Isharat. Hazin also read Hadith under Mulla Muhsin, and other sciences under the Maulana Lutfullah Shirazi, and last of All, Hazin also attended the lectures of Maulana Muhammad Sadiq of Ardistan and read studied him famous and unfamous books on theoretical and practical philosophy.

HAZIN IN INDIA

Thatta was the first place for Hazin in India where he went in March 1734 and stayed there for nearly two months. Leaving Thatta by a boat, he crossed Sewistan and reached Khuda Abad where he stayed for seven months. From Khuda Abad, Hazin again took a boat and reached Bakkar in 1147 A.H., he stayed there for One month. From Bakkar Hazin slowly made his way for his destination Delhi via Multan where he stayed for two years. Hazin reached Delhi by the end of 1149 A.H.

Hazin came to Banaras after he left Delhi in 1161 A.H/1747 A.D. roaming about for a while in the cities of Bengal before he settled down there. He preferred Banaras over all other cities of India. It seems that one of the main reasons for the selection of Benaras by Hazin was the presence of Raja Balwant Singh the ruler of the region. The Raja encouraged Hazin to settle there. According to the compiler of Tarikh-i-Banaras, the Raja took a great liking to Hazin and was a very much interested that he lived in Benaras.

Reciprocally, Hazin also showed his sincerity to maintain his relations with him. Even at the time the Raja revolted against the Nawab of Awadh, Hazin requested the Nawab to forgive him. Raja appointed Hazin as the tutor of his son, prince Chet Singh. The prince also presented gifts to his tutor in the form of cash that amounted to forty thousand rupees.

It is true that due to his obsessive attachment to his own country, Hazin had no pleasant time in India, while his illness aggravated his discomfort, but he had friends who cheered him up. In the letters of them, mostly Iranian, but also Indians, he used terms of endearment, such as sahib-i-man, jan-i-man, and ummid gah-i-man. His politeness with them was unique also. In Hazin's view, Raja Ram Narayan was a valuable friend due to his compassion, generosity and devotion. Any how Hazin's condition compelled him to stay forever in India, and became habitual of living in Banaras.

Since Hazin was qualified in religious guidance (Ijtihad) some people sought legal opinions from him. One of Hazin's treatises under the title of Risala Fatawi, contains 37 legal questions and their answers.

Some time the people of Banaras also believed that Hazin was a thaumaturge having certain revelation and the gift of miracles. They even say that the Sun also submitted to him and that he could work at his will other miracles no less ordinary.

It is mentioned in the Naghma-i-Andalib, that Hazin had composed books on Talisman, necromancy, captivation and augmenting.The inhabitants of the Banaras whether Hindus and Muslims were extremely reverent towards Hazin. They came over long distances to see him; and prided in having seen him. Hazin lived at Banaras for a long time in such a manner that people suspected him of receiving divine help and knowing alchemy, and having Jinn under his control. The people of Banaras both Hindu and Muslims use the dust of his feet as collyrium.

Hazin's disciples came from diverse backgrounds, and they were both commoners and elites. The list includes Mirza Haider, resident of Jais in Awadh; Chet Singh, who ruled Banaras, etc.

Hazing was a distuinguished poet also and his opinion was counted as the final word among the Iranian poets. One time when he came back to Isfahan from his first journey to Shiraz, Mirza Abu Talib Shulistani, a literary personality of Shiraz, asked him to judge to works of two poets.

Hazin was influenced by the style of his period of poetry, he used the Sabak-i-Hindi or the Indian style in his poetry. He wrote a lot of books on poetry with more than thousands of couplets. Hazing himself says that I enjoyed the poetry a lot. Hazin also wrote two tazkira.

Hazin also wrote four Diwan, his first Diwan prepared which includes Qasaid, Masnawis, Ghazalyat and Rubaiyat with almost seven or eight thousands couplets. He compiled his second Diwan including ten thousansds couplets in Isfahan before 1715, third Diwan compiled in 1717, while fourth Diwan compiled before 1729. One of his verses he refers to it completion in 1742 in Delhi.

LAST DAYS OF HAZIN

Towards the end of his life, Hazin gave up all his pleasures and necessities nd perceive in

himself no more power of action. He caused his tomb to be constructed where he sometimes used to go on Thursdays to sit there and distribute alms and prey there. Hazin finally died in the midnight of Thursday, the 11th jamada I, 1180 A.H./15th of October , 1766 A.D., in Mohalla Kacchi Sarai.

To conclude, Hazin was a man of international reputation, for his scholarship, piety, power to acquire knowledge about religious scriptiures and Hadith, Astronomy, science, Talisman, ecology etc. He was a great poet of his age and wrote with the pen name of Hazin. In practise Hazin led the life of a sufi saint. His excluded manners, extreme piety, perfect contentment and whole hearted hatred worldly pleasures and falsehood are clear indications of his mode of life included him among the greatest sufis of his age.

Refrence:-

1- Introduction to Master's tr. Of Hazin's Tazkirat-ul-Ahwal, p. i; Browne's Literary History Of Persia, vol. IV, p. 277; Oriental Biographical Dictionary, p. 159.

2- Tazkirat-ul-Ahwal, Lucknow ed., p. 5.

3- Ibid., pp. 6-7.

4- Ibid., p. 10; Kulliyat-i-Hazin, Lucknow edition, p. 920.

5- Tazkirat-ul-Ahwal, pp. 7-8.

6- Ibid., pp. 10-11.

7- Ibid., p. 11.

8- Lahijan: A town in Gilan to the east of the Sufid-Rud and north of the mountain Dulfak.

9- Tazkirat-ul-Muasirin,Lucknow edition, p. 951; Tazkirat-ul-Ahwal, p. 24.

10- Tazkirat-ul-Ahwal, p. 12.

11- Ibid., p. 29.

12- A part of the book called Shifa composed by Abu Sina.

13- Sharah-ul-Isharat by Muhammad bin Al-hasan, dated 672 A.H.

14- Ardistan, a Persian town .

15- Tazkirat-ul-Ahwal, p. 47.

16- Tazkirat-ul-Ahwal, p. 117.

17- Khuda Abad a ruined town in the Dadu Taluka of Larkana, Sindh.

18- Tazkirat-ul-Ahwal, p. 117

19- Khizana-i-Amira, p. 193.

20- Ghulam Ali Azad Bilgirami, Tazkirat-ul-Ahwal, P. 143.

21- Ghulam Husain khan, Balwant Nama, MS. National Archives of India, p. 155

22- Hazin, Ruqa'at, Aligarh MS., 286, f. 42a.

23- Ahmad Gulchin maani, Tarikh-i-Tazkiraye Farsi, Tehran, 1969, vol. I, p. 354.

24- Araish-i-Mahfil, p. 89.

25- Sheikh Ahmad Ali Khan Hashimi,Makhzanul-Gharaib, Rampur MS., 57, f. 263a.

26- Naghma-i-Andalib, Br. Mus. MS. Or. 1811, ff. 66a-66b; Safina-i-Khushsu, Bankipur, MS. 690, f. 182a.

27- Sheikh Ahmad Ali Khan Hashimi, Makhzan-ul-Gharaib, Lahore, 1968, pp, 803-804.

28- Abdul Latif Shustari, Tuhfatul-ul-Alam,Tehran, 1984, p. 36.

29- Tazkirat-ul-Ahwal, p. 180.

30- Ibid.,p. 152.

30- Hazin, Tazkirat-ul-Muasirin, p. 90.

31- Tazkirat-ul-Ahwal, p. 175.

32- Ibid., p. 225.

33- Hazin, Diwan-i-Ash'ar, Tehran,2005, p. 168.

34- Ghulam Husain Taba Tabai, Siyar-ul-Mutakhirin, Vol. II, p. 615.

35- Araish-i-Mehfil, Calcutta, p. 88

37- Siyar-ul-Mutakherin, vol. II, p. 615.

38- Kulliyat-i-Hazin, MS. 84/163.

☆☆☆

B.S.P: Emergence and Role in Politics

Mohammad Amir, Research Scholar, Department of Political Science, A.M.U, Aligrah

The caste system or manuwad has its roots from ancient times. It was considered that Brahmins are born from God's head and they are ment to become priest or preacher, Kshatriya are ment to become warriors and they are born from God's chest, where as Vaish are from stomach they are born to become farmers for production of food and to feed and lastly Shudra who are born from feets they are untouchables. They were the downtrodden and oppressed section of society. The Dalit movement can be traced out from reformative Bhakti movement. This movement was started by saints, social reformers and scholars who presented their ideas and knowledge by writings, folk culture and belief in one divine super natural power. This movement was anti-caste, anti-elite, pro-women, pro-poor, anti-sanskrit. It was totally against the thousands year old "manuwadi system" that was prevailing in the country.

This movement attracted the downtrodden lower caste people specially women and played a vital role in bringing social consciousness and respect but it could not do something big. The appeals and teaching of this movement led the dalit movement into politics.

Though the contribution of leaders of the downtrodden communities like Mahatma Jyotiba Phule, Chhatrapati Shahuji Maharaj, Narayan Guru and Periyar E.V. Ramaswami has its immense importance in fighting against years old manuwadi system and they fought courageously and with full commitment against the brutual and oppressive manuwadi system but the role of Bhimrao Ambedkar's socio-political campaign has it own importance in bringing respect, consciousness and ability to fight against the harsh and oppressive upper caste. Ambedkar fought not only for dalits but also for those belonging to other backward groups which were too facing the same problems and were victims. Ambedkar was the national leader and he had an impact across the nation.

The Scheduled Caste Federation (SCF) was the first all India political party formed exclusively for scheduled castes. The party was the result of Ambedkar's effort to create a separate

political party for dalits. SCF could not do much and turned into new political party. The Republican Party of India (RPI).

The RPI had clear Goals

" To defeat congress which was dominated by brahmins.

" To improve the condition of SCs.

This organisation too failed because the leaders of party could not arrive at a common consensus on how to achieve these goals, congress was influential political party and some leaders wanted to seek support from congress and others were against it.

After the failure of RPI dalit movement took place under the leadership of Kanshi Ram who had put dalit politics in the main stream. Kanshi Ram used the basic principle of representative democracy. Kanshi Ram had established a category called Bahujans, which comprises of 85% of society. He used this Bahujan Samaj which includes not only dalits but all the downtrodden section including religious minority as a tool to mobilise the dalit population. Kanshi Ram also established a non-political organisation called. All India Backward and Minority Castes Employees Federation (BAMCEF) on 6 December 1973.

Later on 14 April 1984 Kanshi Ram founded B.S.P and in 1989 BSP entered into the competitive electoral politics. During the early 21st century BSP brought the decisive and surprising shift in its basic ideology and electoral strategy. Its main objective and aim was to capture economic and political benefits using state power by this their social status will improve as upper caste became dominant and powerful only by occupying economic and political status

B.S.P. or majority people's party is one of the prominent political party of India. The ideology of B.S.P is "social transformation and economic emancipation" of the " Bhujan Samaj," which comprises of the Scheduled Castes (SCs), the Scheduled Tribes (STs), the Other Backward Classes (OBCs) and religious Minorities such as Sikhs, Muslims, Christians, Parsis and Buddhists.

The orthodox Hindu culture and traditions are recognised by dalit leaders as factors responsible for the marginalisation of dalits. The B.S.P has its main base in the Indian state of UP. B.S.P focused on "social engineering" to bring brahmins and poor upper castes together through

the policy of "Sarvajan". This social engineering became successful and resulted in huge victory of B.S.P in 2007 under the leadership of Mayawati who is still the head of B.S.P.

The BSP has been changing its political stance very frequently as a result of the rapid political changes in UP. The BSP changed quite a lot in the 1990s and first decade of the 21st century. When the BSP started as a political party in early 1990s its agenda was based on 'self respect. This agenda pushed the BSP into an aggressive public dialogue against the political parties dominated by the upper castes, i.e., the Congress and BJP. The public language that the BSP used for the expression of its political views through the media and party literature was very aggressive. The political language of the party leader (Kanshi Ram and Mayawati) sometimes was hard line. The political priorities of the BSP were largely influenced by the immediate need of the party to become the chief political actor in UP and to grab power. So much so that prime goal of the party during 1989-95 was to propel political instability in the state, so that none of the political parties could form the government in the state. Kanshi Ram confirmed the party strategy as: "We wish that no political party could get proper majority, then only we will be politically important for others".

The BSP has been very careful about opening its party forum to all sections of society particularly the upper castes. Leadership positions in the party were closed to upper caste people. This ideology of BSP established it as a centralist party or a party of a social clan in competitive democratic politics. The party believes that state power is the 'key' o r agent to introduce social change.

The party has started many welfare programmes and benefits were provided into dalits exclusively. In 1995 scholarships for dalit students up to eighth standard were given. The BSP government also arranged coaching centers to prepare SC/ST students for the civil services examinations at the state and central levels. Mayawati started the Ambedkar Rojgar Yojana (Ambedkar Employment Scheme) for dalit women. In 1997, RS 700 million was allocated for setting up schools on the ashram model for the children of the Balmiki (SC) caste. Marriage support money for SC girls was increased.

After attaining the state power in 1995 and 1997, the BSP's priorities for development

were clear. The party's focus was more on rural development. The party viewed rural department as development of SC/ST. The BSP government adopted the Ambedkar Village Programme (AVP) as a premier programme for village development through which the interests of its social base could be secured. This programme was initiated by the SP Government in 1991 but later it was largely credited to the BSP. This programme was introduced only in those villages where SC/ST population was 50 per cent or more. During first three tenures of the BSP government 19, 176 villages were declared as Ambedkar villages.

Among the upper castes, the BSP added Brahmins prominently to its electoral and gave them many ministerial posts in the government in 2007. The time ripe for the BSP to bring changes in the political and developmental priorities it had been practicing for more than 20 years. Mayawati wants to do the same which Ambedkar left in between. Now the mission will spread from Kanyakumari to Kashmir.

Conclusion

The caste system or manuwad can be traced out from ancient ages. It is based on "varna system and jati". Varna can be translated as "class" and refers to the four social classes which existed in the vedic society namely Brahmins, Kshatriyas, Vaishyas, Shudras certain groups now known as dalits were considered as untouchables. The work of all above social class is defined by birth.

Dalit movement is not new it was started by saints and social reformers in the name of bhakti movement which was anti-caste, anti-elite, anti-sanskrit and pro-women and was against manuwadi system.

Ambedkar played a vital role in reviving the dalit movement. He not only fought for dalit but also for those belonging to other backward classes. Ambedkar was the national leader and he had an impact across the nation.

The first political party which was exclusively for schedule caste was Schedule Caste Federation (SCF). It was the result of Ambedkar's effort but it could not do much. Later it turned into Republican Party of India (RPI) but it failed.

Later the dalit movement came under the leadership of Kanshi Ram who had put the dalit

politics in main stream by founding Bhujan Samaj Party a political organisation in 1984 and in 1989 this party entered into competitive electoral politics. BSP focused on social engineering which resulted in a huge victory of BSP in 2007 assemble election in U.P. and currently it is the largest opposition party.

References

Akela, A R (2006). Kanshi Ram Saahab ke Sakshatkaar(Interviews with Kanshi Ram). Aligarh: Anand Sahitya Sadan.

----- (2008). Bahin Ku. Mayawati ke Sakshatkaar (Interviews with Mayawati). Aligarh: Anand Sahitya Sadan.

Brass, Paul R (1968). 'Uttar Pradesh'. In Myron Weiner (ed), State Politics in India. Princeton: Princeton University Press.

Dreze, Jean and Harris Gajdar (1997). 'Uttar Pradesh: The Burden of Inertia'. In Jean Dreze and Amartya Sen (eds), Indian Development: Selected Regional Perspectives. New Delhi: Oxford Press.

Duncan, Ian (1999). Dalits and Politics in Rural North India: The Bahujan Samaj Party in Uttar Pradesh. The Journal of Peasant Studies, October. Election Commission of India. General Election Results and Statistics, available on http://eci.nic.in/eci_main/StatisticalReports/ElectionStatistics.asp, accessed on February 24, 2010.

Guru, Gopal (1999). 'The Dalit Movement in Mainstream Sociology'. In S M Micheal (ed), Dalits in Modern India: Vision and Values. New Delhi: Vistar Publication.

Hasan, Zoya (1989). 'Power and Mobilization-Pattern of Resilience and Change in Uttar Pradesh'. In Frankel R Francine and M S A Rao (eds), Dominance and State Power in Modern India: Decline of a Social Order. Delhi: Oxford Press.

Jadhav, Narendra (1993). Dr Ambedkar's Economic Thought and Philosophy. Bombay: Popular Publication.

Jaffrelot, Christophe (2003). India's Silent Revolution- The Rise of the Low castes in North Indian Politics. New Delhi: Orient Longman/Permanent black. ----- (2005). Analysing and

Fighting Caste: Dr Ambedkar and Untouchability. New Delhi: Permanent Black.

Joshi, P C (1972). 'Review Article', Seminar, May.

Kohli, Atul (1987). The State and Poverty in India: The Politics of Reform. Cambridge: Cambridge University Press.

Kothari, Rajni (1970). Caste in Indian Politics. Delhi: Orient Longman.

Kumar, Vivek (2007). Behind the BSP Victory. Economic and Political Weekly, June 16,. 17

Lerche, Jens (2003). 'Hamlet, Village and Region: Caste and Class Difference Between Low Caste Mobilization in East and West UP'. In Roger Jeffery and Jens Lerche (eds), Social and political Change in Uttar Pradesh. New Delhi: Manohar. Lynch, Owen M (1969). The politics of Untouchability: Social Mobility and Change in a City of India. New York: Colombia University Press. (quoted in Sudha Pai (2001))

Mayawati, Kumari (2001). Bahujan Samaj Aur Uski Rajniti. quoted in Pai (2004). ----- (2007). Interview with Mayawati, published in Uttar Pradesh Sandesh, June-July. quoted in Akela (2008).

Mishra, Amaresh (1995). Limits of OBC-Dalit Politics. Economic and Political Weekly, 30 June 10.

Omvedt, Gail and Bharat Patankar (1979). The Dalit Liberation Movement in Colonial Period. Economic and Political Weekly, 14 (7 & 8).

Outlook (2007). Interview with Mayawati, May 28, Delhi.

Pai, Sudha (2001). 'From Harijan to Dalits: Identity Formation, Political Consciousness and Electoral Mobilization of the scheduled Castes in Uttar Pradesh'. In Ghanshyam Shah (ed), Dalit Identity and Politics. New Delhi: Sage. ----- (2002). Dalit Assertion and the Unfinished Democratic Revolution: The BSP in Uttar Pradesh. New Delhi: Sage.

----- (2003). Deprivation and Development in UP: The Economic Agenda of the BSP. Man and Development

Sen, Bhawani (1962). Evolution of Agrarian reforms in India. Delhi: People's Publishing House.

वैजलभूपति कृत 'प्रबोधचन्द्रिका' में नीति एवं व्याकरण विद्या का महत्त्व

डॉ० जफर इतेखार ‹अतिथि प्रवक्ता, संस्कृत विभाग, अ०मु०वि०, अलीगढ़ (उ०प्र०)

वैजलभूपति कृप 'प्रबोधचन्द्रिका' व्याकरण का छन्दोबद्ध ग्रन्थ है। वैजलभूपति ने ग्रन्थ के आरम्भ में आत्मपरिचय इस प्रकार दिया है:-

चन्द्रावती-वदन-चन्द्र चकोर-श्रीविक्रमादित्यभूपतनयो१ नयतन्त्रवेत्ता ।

चौहान वंश तिलकः पटनाधिनाथो राजा परं जयति वैजलदेव नामा ।। २ ।।

राजा वैजलदेव चौहान वंश के तिलक रूप नीति एवं तंत्रशास्त्र के ज्ञाता हैं । चन्द्रावती उनकी राजमहिषी तथा पटना उनकी राजधानी है । ग्रन्थकर्ता द्वारा दी गई इस सूचना के आधार पर भारतीय इतिहास में वैजलदेव के सम्बन्ध में प्रमाणित जानकारी प्राप्त नहीं होती । श्री युधिष्ठिर मीमांसक ने व्याकरण शास्त्र के इतिहास में वैजलभूपति का विज्जलभूपति के नाम से उल्लेख किया है। मोतीलाल जोषी का विचार है 'पटनाधिनाथ' षब्द पटना नगर के लिये प्रयुक्त नहीं है, पटना के लिये सर्वत्र पाटलिपुत्र का उल्लेख मिलता है। पटना षब्द पाटन के लिये प्रयुक्त हुआ है। भारतवर्ष में पाटन जनपद अनेक स्थानों पर है । राजस्थान में भी पाटन अनेक है, अतः निर्णायक रूप में यह नहीं कहा जा सकता कि वैजलदेव कौन से पाष्टन के अधिपति रहे ।२

रामपुर रज़ा लाइब्रेरी रामपुर में प्रबोधचन्द्रिका की जो प्रति उपलब्ध है उसकी पुष्पिका के आधार पर प्रबोधचन्द्रिका का लिपिकाल संवत् १६०७ षक् १७७२ है ।३ इस पुस्तक की रचना वैजलदेव ने अपने पुत्र हिराधरम को विद्या तथा व्याकरण की महिमा बताने के लिये की है । वैजलभूपति ने व्याकरण जैसे दुरूह विषय को अत्यन्त सरस बनाने का प्रयास किया है। निम्न श्लोक में कवि ने राम शब्द की समस्त विभक्तियों का प्रयोग किया है-

रामो मेघभिहितं करोतु सततं रामं भेज सादरं ।

रामेणापहृतं समस्तदुरितं रामाय दत्तं धनम् ।।

रामान्मुक्तिरभीप्सिता सरभसं रामस्य दासोस्म्यहम् ।

रामे रंजतु मे मनः करुणाय भो राम ! मां पालय ।। ३ ।।

राम नाम का उच्चारण भवसागर से पार लगाने वाला है। अतः रामनाम से युक्त प्रक्रिया कर रहा हूँ। यह प्रबोधचन्द्रिका दुःख हरण करने वाली तथा अज्ञान अन्धकार का नाष करने वाली है-

प्रबोधचन्द्रिका नाम रामचन्द्रसमाश्रिता।

अज्ञानतिमिरध्वंसकारिणी दुःखहारिणी ।।४ ३५ ।।

बहुत से प्रक्रिया ग्रन्थ हैं उससे क्या हानि ? भ्रमर द्वारा चमेली का पान कभी अनादृत नहीं किया जाता-

बहवः प्रक्रिया ग्रन्थाः सन्ति चेत् सन्तु का क्षतिः ।

मालतीमधुनक्वापिमधुपानामनादृतम् ।।५ ३६ ।।

बालकों के ज्ञान हेतु विद्वानों की तुष्टि हेतु एक कल्पपर्यन्त इस संसार में कीर्ति की स्थापना हेतु राम नामात्मक प्रक्रिया कर रहा हूँ।

राम के परम भक्त वैजलदेव ने एक बार एकांत में इस प्रकार चिंतन किया । वज्र सदृष हड्डी वाले दधीचि तथा चर्म कवच वाले कर्ण दानों इस संसार में अमर नहीं रहे । इस संसार में सब कुछ पद्मिनी के पत्र पर स्थिर जल की भाँति है । ग्रन्थों में अंकित कीर्ति ही स्थिर है । इस प्रकार चिन्तन करते हुए वैजलभूपति ने खेलते हुए अपने पुत्र श्रीहिराधरम से इस प्रकार कहा-

चिन्तयन्निति निर्यातः क्रीडंतं श्री हिराधरम ।

श्रीमन्वैजलभूपालो विलोक्येत्यब्रवीत्सुतम् ।।६ ११ ।।

विद्या से राज्य की षोभा है । विद्या से षत्रु पर विजय मिलती है । विद्या से कर्तव्य का बोध होता है तथा यष की प्राप्ति होती है । विद्या से धर्म उत्पन्न होता है । धर्म से धन, धन से राज्य तथा राज्य से सुख की प्राप्ति होती है । विद्या पिता की भाँति हित करने वाली, माता की भाँति रक्षा करने वाली, प्रिया की तरह सुख देने वाली है । इस प्रकार विद्या कल्पलता के समान है । विद्या धन सर्वोत्तम धन है । यह देने पर बढ़ता है । न दिये जाने पर नष्ट हो जाता है । विद्या रूपी धन राजाओं के द्वारा छीना नहीं जा सकता । इसका विभाजन नहीं हो सकता । सेवकों द्वारा उपयोग नहीं किया जा सकता तथा कहीं पर छिपाया नहीं जा सकता है । हे पुत्र ! विद्यारूपी धन से हीन पुरुष कायर पुरुष कहलाता है । अतः विद्या प्राप्ति के लिए निरन्तर प्रयत्न करो । जब तुम्हें राज्य का गर्व नहीं है, जब तक विषयों में आसक्त नहीं हो, जब तक यौवन का मद नहीं है, तब तक विद्या की प्राप्ति हो सकती है । उदारता, धीरता, वीरता आदि गुणों से युक्त विद्या एवं विनय से युक्त व्यक्ति सभी को प्रिय

होता है । दान-दया एवं युद्ध में कर्तव्य पालन करने वाला व्यक्ति दानवीर, दयावीर एवं युद्धवीर कहलाता है । मानव कर्म से प्रतिष्ठा प्राप्त करता है । जैसे राम, परशुराम, कृष्णादि । मनुष्य संसार में अपने पूर्वजन्म के कर्म अनुसार ही राजा अथवा रंक होता है तथा सुख-दुःखों का भोग करता है । यह कर्मबन्ध आत्मकृत तथा सभी के लिये दुष्कर है ।७

पिता के द्वारा इस प्रकार कहे जाने पर हाथ जोड़कर विनीत हिराधरम ने इस प्रकार कहा, माता-पिता पुत्र को तीखी, कड़वी, कसैली औषधि पिलाते हैं। जो पान के समय नीरस तथा परिणाम के समय रसावह होती है । हे पूज्य ! आपके उपदेष रूपी अमृत का मैंने श्रवण रूपी अ□जलि से पान कर लिया है । आज्ञा दीजिये मुझे क्या पढ़ना चाहिये ?

वैजलदेव कहते हैं राज्य के लिये नीतिविद्या तथा अस्त्रविद्या ये दो विद्यायें कही गई हैं । इनमें नीतिविद्या अधिक महत्वपूर्ण है, जिससे राज्य मिलता है । क्रिया एवं कारक के विषिष्ट ज्ञान से शाब्दि बुद्धि बढ़ती है । स्यादि तथा त्यादि विभक्तियों के ज्ञान से शब्द सम्बन्धी ज्ञान बढ़ता है । व्याकरण के बिना वाणी, पति के बिना स्त्री, सुविवेक के विना लक्ष्मी कभी सुखदायी नहीं होती है । अतः तुम पहले बुद्धि की वृद्धि हेतु व्याकरण पढ़ो । इसके पष्चात् नीति को पढ़कर सुखपूर्वक राज्य का उपभोग करो । जिसके द्वारा क्रिया और कारक के सामञ्जस्य से ज्ञान उत्पन्न होता है, वह उत्कृष्ट प्रक्रिया प्रबोधचन्द्रिका अब तुम्हें पढ़नी चाहिए ।८

सन्दर्भ

१. डेण् तंरू धीर, श्री विक्रमार्कतनयों

२. प्रबोधचन्द्रिका, सम्पादक व व्याख्याता पं० मोती लाल जोषी, राजस्थान संस्कृत साहित्य सम्मेलन, पृ० १ ।

३. इति श्री पटनाधिनाथ भूपतिशिरोमणि बैजलभूपाल विरचिता वैयाकरणप्रवोधचन्द्रिका समाप्तम् । स्वस्ति श्री संवत् १६०७ तत्र षकः १७७२ पौष शुक्ल प्रतिपदा भृगुवासरे शुभं भूयात् श्रीराम जी सदा सहाय श्री सरस्वत्यै नमः श्रीगणपतये नमः इदं पुस्तकं लिखितं मिश्रहरिप्रसाद तस्यात्मजः गिरधारीलाल स्वंय पठनार्थम् पाण्डुलिपि संख्या १५२०१ ।

४. तंरए चित्तहारिणी ।। ३४ ।।

५. तंरए पन्थाः मालती-मधुनो भृगैः ।। ३५ ।।

६. तंरए हराधरम ।। ११ ।।

७. न संप्रति सरीराणि न राज्यानि धनानि च ।

तेशां स्वर्गगतानां हि कीर्तिर्जयति भूतले ।। ६ ।।

तंरए षरीराणि.....स्वर्गतानां ।। ६ ।।

पद्मिनीपत्रजलवत् संसारे सर्वमस्थिरम् ।

कीर्तिरक्षरसंवद्धा स्थिरा भवति भूतले ।। ७ ।।

इह लोके सुखं येन परलोकेघपि जायते ।

तदेव प्रत्यहं कर्म कर्तव्यं दूरदर्षिना ।। ८ ।।

तंरए हरिदर्षना ..... ।। ८ ।।

संसाराम्भोधितरणं रामानामानुकीर्तनम् ।

रामानामान्विता तस्मात्प्रक्रिया क्रियते मया ।। ९ ।।

बालकां प्रबोधाय तोशाय विदुशामपि ।

आकल्पमपि संसारे कीर्तिसंस्थापनाय च ।। १० ।।

तंरए कल्पमपि ।। १० ।।

विद्यया द्योतते राज्यं विद्यया जीयते रिपुः ।

विद्यया ज्ञायते कृत्यं विद्यया लभते यषः ।।

त्ंरए लभ्यते..... ।। १२ ।।

विद्यया जायते धर्मो धर्मेणार्थः प्रजायते ।

अर्थेन जायते राज्यं सुखं राज्ञज्येन जायते ।। १३ ।।

विद्या पितेव हितकृद्विद्या मातेव रक्षिका ।

विद्या प्रियेव सुखदा विद्या कल्पलतोपमा ।। १४ ।।

धनानामपि सर्वेशां विद्याधनमनुत्तमम्

वर्द्धते दीयमानं यन्नांतरायैविनस्यति ।। १५ ।।

त्ंरए यदंतरायाद्विनष्यति..... ।। १५ ।।

स्वकर्मणैव पुरूशः प्रतिश्ठाधिश्ठतो भवेत् ।

यथाकृश्णष्चरामष्चपश्रुरामष्चपौरूशात् ।। २२ ।।

त्ंरए यथा रामः पर्षुरामः रामकृष्णौ स्व-पौरूशात् ।। २२ ।।

८. प्र०च०, २३-३७

संकेत-सूची

त्ंर. प्रबोध चन्द्रिका, सम्पादक व व्याख्याता-पं० मोती लाल जोषी, राजस्थान संस्कृत साहित्य सम्मेलन

त्ंउ. रामपुर रज़ा लाइब्रेरी रामपुर-वैयाकरण प्रबोध चन्द्रिका, पाण्डुलिपि संख्या-१५२०१ ।

☆☆☆

ان تمام کے علاوہ آصف جاہی دور کے سرکاری پرچم بھی بہت سے اس میوزیم کے ذخیرے میں محفوظ ہیں جو پیلے رنگ کے ہیں۔ پہلی سطر میں العظمت اللہ لکھا ہوا ہے اور بیچ میں دوسری سطر نظام الملک آصف جاہ لکھا ہوا ہے اس کے اوپر نواب میر عثمان علی خان کی دستار سرخ رنگ سے بنائی گئی ہے اور آخری سطر میں یا عثمان تحریر ہے۔

اس کے علاوہ ایک اہم ایرانی زیبائشی پردہ جس کا سلسلہ داخلہ نمبر p.1 ہے اس پردے پر فنکاروں نے ایک تاریخی واقعہ کی عکاسی کی ہے۔ جس میں حضرت یوسف کا قصہ نمایاں ہے۔ اس تصویر میں ایک تخت پر حضرت زلیخا کو بیٹھے ہوئے دکھایا گیا ہے اور ان کے چاروں طرف دیگر خواتین ہیں جن کے ہاتھوں میں سیب اور چاقو ہیں محل کا اندرونی منظر ہے ان تمام کے علاوہ تین سیاہ فام خادمین کو پیش کیا گیا ہے۔ تخت کے سامنے سے حضرت یوسف کے حسن کو ظاہر کرنے کی کوشش اور ترجمانی کی گئی ہے حضرت یوسف کے حسن و جمال کو دیکھ کر ان خواتین نے اپنی انگلیاں زخمی کر لینے کا منظر پیش کیا گیا ہے اور ایک شعر بزبان فارسی درج ہے:

حسن آن بہ بینی دوست از ترنج سہلہائے
روا بود کہ ملامت کنی زلیخا را

اس پارچہ کے آخر میں استاد عمل آقای لکھا ہوا ہے اس طرح کے اعلیٰ وارفع نوادرات حیدرآباد کے اس میوزیم میں تاریخی آثار محفوظ ہیں جو دکن کی ہی نہیں دنیا بھر میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر وای ایس آر، اے پی اسٹیٹ میوزیم کا شعبۂ پارچہ جات

سید عادل احمد، اسٹیٹ میوزیم حیدرآباد

میوزیم کا شعبہ پارچہ جات:

زمانہ قدیم کے پارچہ جات اس شعبہ میں محفوظ ہیں جس میں دو ہزار سے زیادہ مختلف النوع نقش ونگار اور اور دست کاری کے اعلیٰ نمونے جو آصف سابع کے دور حکومت میں صنعتی نمائش کے لئے پیش کئے جاتے تھے۔ان پارچہ جات میں شیروانیاں، ساڑی، کرتی، چغے، مسند، رومال، دوپٹے وغیرہ کے علاوہ کمر پٹے، دیواروں کی خوبصورتی کے لئے لگائے جانے والے آرائشی وزیبائشی پردے جن پر پھول بیل بوٹے کے علاوہ مذہبی تصاویر جن میں گوتم بدھ، وشنو بھگوان، لکشمی (دولت کی دیوی) کے علاوہ خوبصورت لڑکیوں، ہرن، شیر وغیرہ ان پر بڑے دلفریب انداز میں نقش ونگار کئے گئے ہیں۔

ان پارچہ جات کے ذخیرہ میں ایک پارچہ (جس کا نمبر H. M. 2608) ہے جس پر

ایک برہمن اور ایک خوبصورت عورت کو پیش کیا گیا ہے۔اور ان دونوں کے پہلو میں ایک خادم و خادمہ کو دست بستہ کھڑے ہوئے دکھایا گیا ہے۔اس کے علاوہ ان کے جسموں پر زیور وغیرہ بڑے پرکشش انداز میں اتارا گیا ہے جسے اس کی فنکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کہا جاسکتا ہے۔

ان پارچہ جات میں ہندوستان کی دیگر ریاستوں گجرات، راجستھان، آگرہ کے علاوہ دیگر ممالک کے پارچہ جات بھی اس میوزیم کے ذخیرے میں موجود ہیں ان پارچہ جات میں چین کا ریشم، بنارسی، تاشقندی دستی پارچہ جات بھی رکھے گئے ہیں۔زمانہ قدیم میں شاہان مملکت، امراء، وزراء جن تھیلیوں میں اشرفیاں وغیرہ رکھتے تھے وہ بھی قابل دید ہیں ان تھیلیوں پر سونے اور چاندی کے دھاتوں سے بنت کاری کا کام کیا گیا ہے۔

زیادہ تر پارچہ جات پر بہترین بنت کاری کام کیا ہوا ہے اور اس پر دلکش ونفیس بھول بوٹے کے علاوہ مختلف مختلف زبانوں میں جن میں عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی، تلگو اور اردو میں تعارفی اشعار کے علاوہ دعائیہ کلمات، بنت کار کاریگروں کے نام وغیرہ درج ہیں۔

H. M. 3697 اس پارچہ پر سوجنی نما ہے، بیل بوٹے اور ہرنوں کے علاوہ چاروں طرف بخط نستعلیق فارسی اشعار لکھے ہوئے ہیں۔اس پارچہ پر رنگوں کو بہت ہی خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے جو قابل دید ہے۔